شہ پارے

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

شہ پارے

بمبئی بک ہاؤس

ترمیم شدہ نیا ایڈیشن
۱۹۵۴ء

دو روپے

پبلشرز بمبئی بک ہاؤس
۵۔ محمد علی روڈ
پوسٹ بکس ۳۲۴۳
بمبئی ۳

فہرستِ مضامین

حصّۂ نثر

صفحہ

حصۂ نظم

سرسید احمد

سرسید احمد ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنی والدہ سے پائی۔ بائیس سال کی عمر میں مروّجہ تعلیم سے فراغت حاصل کرکے انگریزی سرکار میں ملازم ہوگئے اور متعدد بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

۱۸۷۵ء میں سرسید نے علی گڑھ میں اینگلو محمڈن اسکول کی بنیاد رکھی۔ یہ اسکول بہت جلد ترقّی کرکے اعلا درجہ کا کالج بن گیا اور اب ہندوستان کی ایک مشہور یونی ورسٹی ہے۔ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے پنشن لے کر اپنی زندگی کو قومی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ ملک و قوم اور زبان و ادب

کی مختلف خدمات انجام دے کر اِس ہمدردِ قوم، مُصنِّف، مُدبِّر، مصلح اور ماہرِ تعلیم نے ۱۸۹۸ء میں رحلت فرمائی۔

سرسید نے یوں تو زندگی کے بہت سے شعبوں کی اصلاح کی، لیکن اُردو دُنیا خاص طور پر اُن کی ممنونِ احسان ہے۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ خود اُردو کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی بلکہ اپنے گرد مُصنِّفوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر لیا تھا "جس کا ہر فرد ایک ادبی ریاست کا مالک تھا۔" اُنھوں نے اپنے اثر اور اپنی تربیت سے بھی بہت سے اچھّے اچھّے انشا پرداز اور مصنّف پیدا کئے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، وحید الدّین سلیم، مولوی چراغ علی، مولوی عزیز مرزا، عبدالحلیم شرر سب سرسیّد ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔

سرسیّد کی تحریروں میں روانی، جوش

اور زورِ استدلال پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں اُن کی تحریروں میں مزاح کا بھی ہلکا سا رنگ آجاتا ہے۔ محاکات اور منظرکشی کے نمونے بھی اُن کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور یکساں کامیابی کے ساتھ۔ تاریخ مذہب، سیاست، ادب، معاشرت، اخلاق غرض ہر موضوع پر لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔

سرسید کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ آثار الصنادید۔ ۲۔ خطباتِ احمدیہ۔
۳۔ اسبابِ بغاوتِ ہند۔ ۴۔ تفسیر القرآن۔

اُن کے مختلف مضامین کا مجموعہ بھی تہذیب الاخلاق کے نام سے چھپ گیا ہے۔

اُمّید

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ اِس لئے اُس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پُتلے کو اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا اُس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ انھیں قوتوں کے ذریعہ سے گذری ہوئی باتیں پھر دل میں آتی اور آئندہ کی باتوں کا اُن کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہی۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہی۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بُلا لاتی ہی اور اُسی کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہی۔ اُس کی مثال جُگالی کرنے والے جانوروں کی ہی کہ وہ پہلے تو گھاس دانہ سب

کھا لیتے ہیں اور جب ہو چکتا ہی تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اُسی کو پیٹ میں سے نکال کر چبائے جاتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلہ کو بُلا لاتی ہی اُسی طرح ایک اور قوت ہی جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہی اور جس کا نام اُمید و بیم یا خوف و رجا ہی۔ اِن ہی دو قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانہ تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ دوٗر زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں اور ظُلمات کے پردوں میں چھُپی ہوئی ہیں اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں اُن کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں۔ اُن کے ہونے سے پہلے اُن کی خوشی یا رنج اُٹھانے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اُس زمانے کا بھی جب نہ یہ زمین ہوگی نہ آسمان، اور ہر چہار طرف سے لمن الملک الیوم کی آواز آتی ہوگی ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہی کہ انسان کی زندگی صرف موجودہ وقت پر محدوٗد ہی۔

ہماری خوشیاں اِس قدر کم و چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی جس سے انسان اُن عمدہ اور دل خوش کُن

چیزوں کا اُن کے ہونے سے پہلے مزا اٹھاتا ہی جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہی تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزا ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہی کہ "ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی اُمّید رکھنی چاہیئے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہی جس کی اُمّید نہ ہو سکے۔"

فارسی زبان میں مشہور مقولہ ہی کہ "تمنا را عیبی نیست" ایک ظریف نے کہا کہ دُنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہی کیونکہ اُمّید مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہی۔ دوستوں نے پوچھا کہ کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہی۔ اُس نے کہا کہ کیا عجب ہی کہ میں کبھی نہ مروں کیونکہ خدا اِس پر بھی قادر ہی کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو اور مجھ کو اُمّید ہی کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔ یہ قول تو ایک ظرافت کا تھا، مگر سچ یہ ہی کہ زندگی کی اُمّید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہی۔ اگر ہم کو زندگی کی اُمّید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔ زندگی ایک بےجان چیز کے مانند ہی جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی۔ اُمّید اُس میں حرکت پیدا کرتی ہی۔ اُمّید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور بُردباری اور خوش مزاجی کی عادت

ہوجاتی ہی۔ گویا اُمّید انسان کی رُوح کی جان ہی۔ ہمیشہ رُوح کو خوش رکھتی ہی اور تمام تکلیفوں کو آسان کردیتی ہی۔ محنت پر رغبت دلاتی ہی اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہی۔ اُمّید سے ایک اور بھی فائدہ ہی جو کچھ کم نہیں ہی کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے اور اُسی میں محو نہیں ہوجاتے۔ سیزر نے جب اپنا تمام مال و اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا تو اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے لئے کیا رکھا؟ اُس نے کہا کہ اُمّید۔ اُس کی عالی طبیعت اُن چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی جو اُس کے پاس تھیں بلکہ ہمیشہ اُس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

دینی چیزوں کی اُمّیدیں دُنیوی چیزوں کی اُمّیدوں سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں کیونکہ اُن میں عقل کے علاوہ مذہبی اِعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہی۔ اِس قسم کی اُمّیدوں کا خیال ہی ہم کو پورا پورا خوش رکھتا ہی۔ بلاشبہ اُمّید ہی کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہوجاتی ہی۔ اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور

آجاتا ہے۔ مگر مذہبی اُمیدیں اِس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں۔ تکلیف کی حالت میں دل کو سنبھال لیتی ہیں۔ مذہبی اُمید گویا مُردہ کو زندہ کردیتی ہے اور اُس کے دل کو غایت درجے کی خوشی بخشتی ہے۔

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم)

سوالات

۱۔ اُمید وبیم یا خوف و رجا کے ذریعے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہے؟

۲۔ ظریف نے یہ کیوں کہا کہ مجھے مرنے کا بھی رنج نہیں ہے؟

۳۔ اُمید کس طرح زندگی میں حرکت پیدا کرتی ہے؟

۴۔ دینی چیزوں کی اُمیدیں دنیوی چیزوں کی امیدوں سے کیا زیادہ قوی ہیں؟

۵۔ مندرجۂ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

شغل۔ مشغلہ۔ امید وبیم۔ خوف و رجا۔ ظُلمات

۶۔ سید نے اسی موضوع پر ایک اور مضمون لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اُمید کی خوشی"۔ اس مضمون کو آپ پڑھیے۔

محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد ۱۸۳۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد میر باقر علی اور اُردو کے مشہور شاعر ذوق میں بڑی گہری دوستی تھی۔ اِسی لیے آزاد کی تربیت ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ اُن کی والدہ ایک ایرانی خاتون تھیں۔ اِس مُناسبت سے فارسی اُن کی مادری زبان ہوئی اور اُس میں وہ کمال رکھتے تھے۔ ایران کے سفر نے اُس پر اور جِلا کردی۔

آزاد اُن بدقسمت لوگوں میں سے تھے جن کے گھربار غدر کے ہنگامہ میں لوٹے گئے۔ اُن کے والد مارے گئے اور خود اُنھیں دلّی چھوڑنا پڑی۔ وہ لاہور پہنچے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

آزاد اُردو زبان کے بہت بڑے مُحسن ہیں۔

اُن کا درجہ بحیثیت نثار اُردو زبان میں بہت بلند ہے اور وہ اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اُن کا اُسلوبِ تحریر بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔ اُن کے جملے عام طور پر چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ بیان میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ لیکن اُن کا اسلوبِ بیان خیالی ہے۔ وہ تاریخی واقعات لکھنے میں کام نہیں آسکتا۔ ادبی حیثیت سے اُن کا شاہکار آبِ حیات ہے۔ آبِ حیات اُردو شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات میں جدید اُسلوب پر لکھی ہوئی اُردو میں پہلی کتاب ہے۔

آزاد ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ جدید رنگ کی شاعری کو رواج دینے میں اُن کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔

آزاد کی مشہور تصانیف یہ ہیں :-

آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، نگارستانِ فارس، سخندانِ فارس،

ابوالفیض فیضی

۹۵۴ھ میں جب کہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ[1] کی سلامتی میں مُستقر تھی شیخ مبارک شہر آگرہ میں چارباغ کے پاس رہتے تھے کہ نہالِ اُمّید میں پہلا پھول کھلا۔ اِقبال پکارا کہ مراد کا پھل لائے گا۔ کامیاب ہوگا اور کامیابی پھیلائے گا۔ ابوالفیض اس کا نام ہے۔ اُس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا اور علومِ عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروّج تھے اُن میں مہارت حاصل کی۔ مگر فنِ شعر میں جو کمال دکھایا وہ ثابت کرتا ہے کہ فیضی کا دل و دماغ فیضانِ قدرت سے شاداب تھا اور ملک الشعرا اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا لیکن ہمہ داں فاضل تھا۔ بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا، اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا، زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا اور اس پر رُموزِ سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فنِ طِب کو حاصل کیا۔ مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا

---

[1] شیر شاہ کا لڑکا اور جانشین تھا۔

کہ بندگانِ خدا کو معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا اور کچھ اُجرت نہ لیتا تھا۔ جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستگاہ بڑھائی اور فرصت نے تنگی کی تو رِفاہ کی نظر سے ایک شفاخانہ بنوادیا۔

۹۷۴ھ میں بادشاہی لشکر نے چتوڑ پر عَلَم اُٹھائے تھے جو کسی تقریب سے دربار میں اُس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جواہر کے شوق نے ایسا بےقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ وہ بلندخیال شاعر کہ ایک شگفتہ مزاج عالم تھا اپنی شگفتہ بیانی اور دانشِ خداداد اور فراخ دلی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجۂ مصاحبت تک پہنچ گیا اور چند ہی روز میں ایسا ہوگیا کہ مقام ہو یا سفر کسی عالم میں بادشاہ کو اُس کی جُدائی گوارا نہ تھی۔ اُس نے اعلا درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بُلائے گئے اور عالم یہ ہوا کہ مُہمات سلطنت میں کوئی بات بغیر اُن کی صلاح کے نہ ہوتی تھی۔ فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت نہیں لی اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اُدھر ہاتھ ڈالتا تو پہلے شاعری سے ہاتھ اٹھاتا۔ لیکن ملک و مال کے جُزوی جُزوی معاملے اُس کی صلاح پر منحصر تھے۔

جو شاہ زادہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا اکبر اس کی استادی سے فیضی کو اِعزاز دیتا تھا کہ تعلیم و تربیت کرو۔ چنانچہ سلیم، مراد، دانیال سب اس کے شاگرد تھے اور اُسے بھی اِس امر کا بڑا فخر تھا۔ اپنی ہر تحریر میں دو باتوں کا شکر درگاہِ الٰہی میں بجا لاتا ہی۔ اول یہ کہ درگاہ شہنشاہی میں قُربت ہوئی۔ دوسرے شاہ زادوں کی اُستادی سے اِعزاز پایا۔ مگر بار بار ہزار عجز و اِنکسار سے کہتا ہی کہ اُن کے دِلِ روشن پر سب کچھ روشن ہی۔ مجھے آتا کیا ہی جو انھیں سکھاؤں۔ میں اُن سے آدابِ اِقبال کا سبق لیتا ہوں۔

اکبر اُس کو اور اُس کے مرصّع کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سِنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوب صورتی سے بجا لاتے ہیں کہ جو اُس کے لئے مُناسب ہی اُس سے بھی بہتر درجہ پر پہنچا دیتے ہیں اور ہر کام کو جاں فشانی اور دلی عرق ریزی سے بجا لاتے ہیں۔ اِس واسطے اُنھیں اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا اور بہت خاطر داری اور دل داری سے کام لیتا تھا۔ فیضی کو کچھ فرمائش کی تھی۔

یہ حضور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔ اکبر چُپ تھا اور ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ بیربر بھی بڑے مُنھ چڑھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کچھ بات کی۔ اکبر نے آنکھ سے منع کیا اور کہا "حرف مزنید، شیخ جیو چیزی می نویسد۔"، اِس فقرے سے اور وقتِ اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اُنھیں شیخ جیو (شیخ جی) کہا کرتا تھا۔

(دربارِ اکبری)

سوالات

۱۔ اکبر، فیضی اور ابوالفضل کو کیوں اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا؟

۲۔ فیضی کی رسائی اکبری دربار میں کس طرح ہوئی؟

۳۔ فیضی کن باتوں پر فخر کرتا تھا؟

۴۔ "شیخ مبارک ...... پھل لائے گا"، ان جُملوں میں کئی الفاظ ایک دوسرے سے مُناسبت رکھتے ہیں، انھیں چُن کر لکھیے۔

۵۔ مُندرجۂ ذیل جُملوں کو آسان و سادہ اُردو میں لکھیے:

(۱) نہالِ اُمّید میں پہلا پھول کِھلا۔ (۲) فیضی کا دماغ فیضانِ

قُدرت سے شاداب تھا۔ (۳) زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ (۴) اس پر رموزِ سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ (۵) میں اُن سے آدابِ اقبال کا سبق لیتا ہوں۔

۲۔ مندرجۂ ذیل لفظوں کو اس طرح جُملوں میں استعمال کیجئے کہ اُن کا فرق واضح ہو جائے۔

فائدہ ، فیض ، فیضان ۔ نکتہ ، نقطہ ۔ فصاحت ، بلاغت ، عِلم ، عَلَم ، الم ۔ صُحبت ، مصاحبت تعلیم ، تربیت ۔

نذیر احمد

شمس العلما ڈاکٹر حافظ نذیر احمد بجنور کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ پھر دہلی آئے اور وہیں تعلیم کی تکمیل کی، اور دہلی ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری ملازمت کرلی معمولی سی جگہ سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ پھر ریاست حیدر آباد کے بُلاوے پر حیدر آباد گئے۔ چند سال بعد پنشن لے کر دلّی آگئے اور آخر دم تک وہیں رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

حکومت نے اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف مختلف نقد انعامات اور شمس العلما کے خطاب کی صورت میں کیا۔ اِڈنبرا یونی ورسٹی نے اُنھیں اِل اِل، ڈی کی اِعزازی ڈِگری دی۔

نذیر احمد کی عبارت نہایت شُستہ اور
با محاورہ ہوتی ہے۔ بیان میں روانی اور زور پایا
جاتا ہے۔ اُن کے یہاں آزاد کی سی رنگینی نہیں
لیکن اُن کی تحریریں تشبیہوں اور استعاروں سے
خالی نہیں۔ عام طور پر اُن کی تحریروں میں سادگی
و صفائی پائی جاتی ہے، لیکن بعض اوقات وہ عربی
کے غیر مانوس الفاظ بھی اِستعمال کرجاتے ہیں۔ اُن کے
طرز کی ایک نمایاں خصوصیت اُن کی لطیف
ظرافت ہے۔ وہ سب سے پہلے مصنّف ہیں جنھوں
نے اُردو زبان میں نئے انداز کے ناول لکھے۔

ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

ترجمۂ قرآنِ مجید ، الحقوق والفرائض ،
ترجمۂ تعزیراتِ ہند ، توبۃ النصوح ، مرآۃ العروس،

صادِقہ کا اِنتظامِ خانہ داری

ہمارے ملک میں لڑکیاں ایسی چھوٹی سی عُمر میں بیاہ دی جاتی ہیں کہ اُن کو خانہ داری کے لئے تیاری کرنے کی کافی مُہلت نہیں ملتی۔ صادِقہ کو بڑی مُہلت ملی۔ اُس نے ان لیاقتوں کا بہت بڑا ذخیرا جمع کرلیا، جو ایک شریف بی بی اور لائق ماں میں ہونی ضرور ہیں۔ اُس نے ماں کے گھر کو اپنا گھر اور چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنے بچّے سمجھ کر خانہ داری کے سب نشیب و فراز نظر میں کر لئے۔ گھر والے اور نوکر چاکر، گِنے ہوئے بیس آدمی صبح، بیس آدمی شام کھانے والے، اور یہ مہنگا سماں اور اُجلی زندگی، اور کُلّھم سو رُپے مہینے کی آمدنی۔ اسی میں شادی اِسی میں غمی، اِسی میں تیہوار اور اِسی میں آیا گیا بھی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں یہ انتظام ہوتا تو نہیں معلوم کتنی دفعہ دِوالا نکلا ہوتا۔ مگر وہ تو صادقہ ہی

سری کی خوش سلیقہ تھی کہ ہر چیز سے امیری کی شان ظاہر ہوتی تھی۔ بال بچوں کا گھر اور ایسا ستھرا! خدا جانے کیا کمال تھا اور نوکروں اور بچوں کو کیسا سدھایا تھا! ہر ایک دالان میں بھرپور چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ صدر مقام پر جاڑا ہوا تو قالین اور گرمی ہوئی تو سوزنی۔ سوزنی پر گاؤ تکیہ۔ ایک پہلو میں پٹاری، دوسرے میں صندوقچہ، سامنے اُگال دان، اُگال دان پر تہہ کیا ہوا اُجلا رومال۔ دالان کے دونوں طرف دو نواڑی پلنگ، دونوں پر سفید چادریں کسی ہوئی، نہ جھول نہ سِلوٹ۔ سرہانے کے تکئے الگ، بغلی الگ۔ پائینتی کو موسم کے مطابق چادر یا دولائی، اوپر پلنگ پوش۔ باورچی خانہ، ہم نے صاف دیکھا تو صادقہ کے گھر کا کہ اگر چولھے نہ ہوں تو کوئی تمیز نہ کر سکے کہ یہ باورچی خانہ ہی۔ گھر کی صفائی دیکھ کر خیال گذرتا تھا کہ کیا۔ ہر وقت ایک آدمی جھاڑو لئے کھڑا رہتا ہی کہ کہیں تنکے کا نام نہیں۔ کوٹھریوں میں گھس گھس کر دیکھا تو بلا مُبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کوٹھری بجائے خود دوکان ہی اور اس میں بیچنے کے لئے اسباب سجایا گیا ہی۔ پانی کے مٹکوں کی بھی کچھ اصل ہی۔

باوجودیکہ برسوں دن رمضان کے رمضان بدلے جاتے تھے مگر جب جس کے جی میں آئے جاکر دیکھ لے ایسے معلوم ہوں گے کہ کورے منگواکر رکھے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ دونوں وقت اندر باہر سے مانجھے اور رگڑے جاتے ہیں، اور کائی یا گرد جمنے نہیں پاتی۔ ہم کو بڑی ہی حیرت ہوئی تھی کہ سو روپے میں ایسا گھر کیونکر چلتا ہوگا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ خانہ داری میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی اور اِن ہی میں بہت خرچ بیٹھتا ہے مثلاً بچوں کا ناشتا اور بازار کا سودا سُلف۔ شہر میں رہ کر بازار کے سودے سُلف کی قسم تو کھائی نہیں جاتی، مگر ہاں صادقہ اس اہتمام میں ضرور لگی رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کسی کو اس کی چاٹ نہ پڑنے پائے۔ یہ نہیں کہ وہ بچوں کو ترساتی تھی بلکہ ہر قسم کی خانہ ساز چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں اور وہ یقیناً بازاری چیزوں سے زیادہ لطیف اور مزے دار ہوتی تھیں۔ اِس میں شک نہیں کہ رات کا بچا ہوا باسی کھانا کسی کو نہیں بھاتا، اور اکثر اُس کا مزا بھی اُتر جاتا ہے، اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ چار و ناچار بازاری چیزیں منگوانی

پڑتی ہیں۔ لیکن اوّل تو صادقہ کا اندازا ایسا ٹھیک تھا کہ اگر کبھی کبھار کچھ بچا بھی تو ایسا کہ اُس کو بچنا نہیں کہتے اُس کا اُصول یہ تھا کہ نہ باسی بچے نہ کُتّا کھائے۔ دوسرے اور گھروں میں بس دو وقت کے کھانے کو ضروری سمجھا جاتا اور اُسی کا اِہتمام ہوتا ہے۔ صادقہ کھانے سے بڑھ کر تازا ناشتے کا اہتمام رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی بھول کر بھی بازار کے سودے کا نام نہ لیتا تھا، اور اگر آ بھی گیا تو کوئی چاؤ سے کھاتا نہ تھا، اور یوں مہینے کے مہینے ایک بڑی رقم پس انداز ہوتی تھی۔

زنانے کپڑوں میں وہ کچھ ایسا کتربیونت کر نہ سکی۔ بڑبڑاتی جاتی تھی، مگر بنانے ہی پڑتے تھے۔ لیکن مردانے کپڑوں میں اُس نے ایسا تصرّف کیا کہ اِس مد میں رُپیوں کی جگہ آنوں کا خرچ رہ گیا تھا۔ اُس کو اِس کی بڑی چِڑھ تھی کہ مرد اگرچہ وہ بچّہ ہی کیوں نہ ہو مہین کپڑے پہنے یا عورتوں کی طرح گوٹا ٹھپّا لگائے۔ کچھ ایسی پٹّی پڑھا رکھی تھی کہ آٹھ برس کے لڑکے کی کیا بساط، وہ اپنے کسی ہم عُمر کو کام دار جوتی پہنے دیکھ کر ہنستا تھا۔ پس مردوں کے

کپڑے قیمتی ہوتے تھے مگر سادہ اور چلاؤ۔ لباس کے بارے میں چاہو اِس کو فضول خرچی سمجھ لو کہ ایسے گھر میں دھوبی کو بہت اُڑکر مِلتا تو سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ۔ صادقہ چار رُپے مہینا دیتی تھی۔ مگر اِن کے یہاں کے اُترے ہوئے کپڑے دوسروں کے تازا تہہ دار دُھلے ہوئے کپڑوں سے بہتر ہوتے تھے۔

ایک خاص بات صادقہ کے یہاں ہم نے اور بھی دیکھی کہ اندر باہر مِلاکر پانچ نوکر تھے، مگر اُن کے کام اِس طرح پر بنٹے ہوئے تھے کہ نہ کسی کو کثرتِ کار کی شکایت اور نہ اتنی فرصت کہ اَحدیوں کی طرح پڑے اینڈا کریں۔ اور اس کی بڑی سخت تاکید کہ کوئی دوسرے کے کام میں ہاتھ نہ لگائے اِس سے ہوتا کیا تھا کہ ہر ایک کو اپنی ذمہ داری معلوم ہوتی تھی اور جب کوئی کام بگڑتا تھا ایک شخصِ خاص کو اُس کی جوابدہی کرنی پڑتی تھی۔ یہ نہیں کہ انّا کو خالی بیٹھے دیکھ کر اُس کے آگے سِلائی ڈال دی، سینے والی سے آٹا گندھوالیا، پکانے والی کو کسی کی خیر صلاح کی خبر کو بھیج دیا۔ اپنے کرنے کا کام نہ ہو تو خالی بیٹھی رہو مگر دوسرے کے کام میں دخل نہ دو۔ دیر ہو تو تمھاری بلا سے اور بگڑے تو تمھارے صدقے سے۔

اِس ربط و ضبط کی قدر کوئی اُن کے دل سے پوچھے جو گھر کا انتظام اُٹھائے ہوئے ہیں۔

(رویائے صادقہ)

سوالات

۱۔ صادِقہ نے کس طرح اور کن لیاقتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا؟

۲۔ کن باتوں میں بہت خرچ بیٹھتا ہے؟ صادقہ نے اس کی روک تھام کس طرح کی؟

۳۔ صادِقہ کے نوکروں کو کثرتِ کار کی شکایت کیوں نہیں تھی؟

۴۔ صادِقہ نہایت خوش سلیقہ اور سُگھڑ لڑکی تھی۔ کسی بد سلیقہ اور پھوہڑ لڑکی کے حالات مختصر طور پر لکھئے؟

حالی

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے تھے۔ ابھی صرف نو برس کے تھے کہ یتیم ہو گئے اس لئے باقاعدہ تعلیم نہ پا سکے۔ لیکن اپنے ذاتی شوق کی بنا پر پہلے کچھ عربی فارسی کی کتابیں پڑھیں، پھر صرف و نحو، منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر وغیرہ پڑھی۔ ۱۸۹۳ء میں وہ دہلی میں نواب مصطفا خاں شیفتہ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ شیفتہ صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے اور شاعر سے زیادہ سخن فہم و سخن سنج۔ اُن کی صحبت کا اثر حالی پر بہت گہرا پڑا۔ غالب کی شاگردی نے اُس پر اور جلا کر دی۔

حالی بڑے سادہ مزاج انسان تھے۔ خاکساری، تواضع اور بنی نوعِ انسان سے ہمدردی اُن کی سیرت کے نمایاں

پہلو ہیں۔

حالی کی تحریروں میں صفائی، سادگی اور سلاست و روانی پائی جاتی ہی۔ اُن کے یہاں سید و شبلی کا سا جوش یا آزاد کی سی رنگینی بالکل نہیں ہی۔ پھر بھی اُن کی تحریریں نہایت مؤثر اور وقیع ہوتی ہیں۔ ہندی کے الفاظ وہ اپنی نثر و نظم میں بڑی خوبی سے کھپاتے ہیں۔

حالی کا درجہ شاعر اور نثار دونوں حیثیتوں سے اُردو ادب میں بہت اونچا ہی۔ جدید اسلوب پر سب سے پہلے حالی نے سوانح نگاری کا ڈول ڈالا۔ اِسی طرح اُردو میں سنجیدہ تنقید نگاری نہیں تھی۔ اس کی پہل بھی حالی ہی نے کی۔ شاعر کی حیثیت سے بھی اُن کا مرتبہ بہت بلند ہی۔ ان کا مسدّس "مدوجزرِ اسلام" جو عام طور پر مُسدّسِ حالی کے نام سے مشہور ہی اُردو شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہی، اور آج بھی اُسی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہی جیسے تصنیف کے وقت پڑھا جاتا تھا۔ اُن کی دوسری نظمیں مثلاً بیوہ کی مناجات، شکوۂ ہند، چُپ کی داد وغیرہ بھی

بہت اہم ہیں۔

نثر میں حالی کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، مقدمۂ شعر وشاعری

سرسیّد

ایک حکیم کا قول ہے کہ "جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں مُنصِف ہو، بات کا پکّا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، محنتی ہو، صاحبِ استقلال ہو اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مُستعد ہو وہ شریف ہے۔" اِس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھادی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسیّد کے حق میں جامع ومانع ہوگی۔ جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جس قدر اُس کے دوست اور ملنے والے تھے سب اُس کے مدّاح اور ثناخواں تھے۔ سب اُس سے محبّت رکھتے تھے سب کو اُس پر اعتبار تھا، اور

سب کو اُس کا دُنیا سے اُٹھ جانا ایسا ہی شاق گذرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مُربّی اور سرپرست کا مرجانا شاق گذرتا ہی۔ اِس سے زیادہ کسی شخص کے حُسنِ اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہی! سب سے بڑی دلیل اُس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اُس کو اپنے مقاصد میں ہوئی، کیونکہ لیاقتیں کیسی ہی اعلا درجہ کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلا درجہ کے اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آ سکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پبلک لائف میں بسر کئے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گذرے کہ ایک زمانہ اُس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے ادنا ادنا کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسیّد کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اِعانت منقطع ہو جائے۔ باوجود اِس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اُس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی فیہ نکالتا۔ سِوا اس کے کہ اس کو کافر و ملحد و نیچری و کرستان

کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اُس پر وہ الزام لگائے گئے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا کسی سے کچھ بن نہ آیا جیسا کہ کہا گیا ہے، رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب وگناہ
کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جُدا کئے بغیر نہیں رہتے۔ اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اُس کو پربت بنا دیتے۔ مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اُس کا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبّے سے پاک رہا۔

اگرچہ اِس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسیّد میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں انھیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں۔ مگر جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ اُن عیوب

سے جو انسان کی خساست اور دناءت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُس کے اخلاق کا اُس کے ہم نشینوں اور ہم جلیسوں پر اثر پڑتا تھا اُس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا تھا۔ اُس کی جفاکشی اور مُستعدی اوروں کو جفاکش اور مُستعِد بناتی تھی۔ اُس کی سچائی اور ہمّت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اُس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی کیرکٹر سے قوم میں عُمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

(حیاتِ جاوید)

سوالات

۱۔ سیّد کا مرنا لوگوں کو کیوں شاق گزُرا؟

۲۔ زندگی میں کامیابی کے لئے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟

۳۔ سیّد کے مخالفین کس کوشش میں تھے؟

۴۔ انسان کے اخلاق کا صحیح اندازہ کن باتوں سے ہوتا ہے؟

۵۔ سیّد نے کس طرح اپنے کیرکٹر سے قوم میں اعلا اخلاق کے بیج بوئے ہیں؟ (سیّد کے اخلاق کا ان کے ہم نشینوں پر کیا اثر پڑتا تھا)

سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ایک مُعزّز کشمیری خاندان سے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم رسمِ زمانہ کے مُطابق اُردو فارسی سے ہوئی۔ پھر انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔

سرشار بہت ذہین تھے۔ قوتِ حافظہ بھی غضب کی پائی تھی۔ بہت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے۔

اُردو ادب میں سرشار کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ایک ماہر زبان اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ اُن کی عبارت میں سلاست و روانی اور زور پایا جاتا ہے۔ محاورے بھی وہ بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ کبھی کبھی عبارت میں تصنّع پیدا ہوجاتا ہے۔ لکھنؤ کی بیگماتی

زبان لکھنے میں اُن کو کمال حاصل تھا۔

سرشار کی سب سے مشہور تصنیف، جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، فسانۂ آزاد ہے۔ اِس کتاب میں سرشار نے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا نقشا بہت عمدگی سے کھینچا ہے۔ اِس افسانہ کا پلاٹ تو بہت سادا ہے مگر طرزِ بیان نہایت عمدہ ہے۔ جا بجا پُر لطف ظرافت، پھڑکتے ہوئے فقرے، مزے دار شوخیاں، ترکی بہ ترکی جواب پڑھنے والے کی دل چسپی کو ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔

ان کی دوسری مشہور کتابیں یہ ہیں:۔

سیر کہسار، جامِ سرشار

سرشار نے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔

بٹیروں کی لڑائی

ایک دن میاں آزاد اپنے آقائے نام دار نواب گردوں مدار کی کوٹھی میں دوزانو بیٹھے مصاحبین سے گپ اُڑا رہے تھے۔ کسی کو لکڑی کی چوٹیں، کسی کو کُشتی کے داؤ بتا رہے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا، "کیوں آزاد! کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں؟ نیت شب بخیر! اب کی ربیع الاول میں وہ گھمسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ۔"

مُصاحب۔ میاں آزاد! تم تو اپنے کو بڑا جہانیانِ جہاں گشت سمجھتے ہو، مگر واللہ یہ لڑائی نہ دیکھی ہوگی۔ اِس طرح گتھ جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی! بٹیر کی لڑائی کے آگے تو توپ و تفنگ بھی گرد ہے۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب کے یہاں کی پالیاں، اُفوّہ! آج ہماری سرکار میں جتنے بٹیر ہیں اتنے تو مٹیا برج کے چڑیا خانہ

ہیں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا۔ نوک دُم کے بنانے میں توڑے کے توڑے صرف ہو گئے۔ سیروں موتی مروارید تو میں نے اپنے ہاتھوں پیس پیس کر کھلا دئے ہیں۔ کچھ دنوں روز کھرل چلتا تھا۔ مگر واللہ! آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اِس ڈیوڑھی پر اتنے دن ہوئے اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا۔ لے آؤ، چلو! تم کو سیر کرائیں۔

یہ کہہ کر بٹیر خانہ لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چوطرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں۔ اور کابکیں بھی وہ بیش بہا کہ اُہو ہو ہو! ہاتھی دانت کی تیلیاں، اُن پر گنگا جمنی گمندیاں، اور کارچوبی چھتیں اور مقیش کی جھالر، اُس پر کامدار مخملی غلافیں۔ رنگ برنگ سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں جن میں بٹیر اپنی پیاری پیاری نکیلی چونچوں سے پانی پئیں۔ پانچ پانچ، چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں ہر سمت لٹکی ہیں کھونٹیاں بھی رنگ برنگی۔

مصاحب ایک ایک کابک اُتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پُل باندھ دئے۔ ایک بٹیر کو دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے

کیا منجھولا جنور ہے! صف شکن جو آپ نے سُنا ہو، یہی حضرت ہیں! لندن تک خبر کے کاغذ میں اِس کا حال چھپ گیا۔ میری جان کی قسم! ذری اِس کی آن بان کو تو دیکھئے گا (بوسہ لے کر)، ہائے کیا بانکا بٹیر ہے! یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں! دم کے دم میں لاکھوں پھونک دئے۔ رُپے کو ٹھیکریاں سمجھا کئے۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو شہر کے پتنگ بازوں کو نہال کر دیا۔ کنکوّے والے بن گئے۔ چانڈو کا شوق ہوا تو دقیانوس کے وقت کی نگالیاں ہزاروں رُپے کو خرید لیں اور فی سبیل اللہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو آدمیوں کو ایک ایک دن میں چانڈو پلا دیا۔ افیم اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ رُپے سیر بکنے لگی۔ اللہ کی عنایت سے جو شوق کیا ایسا ہی کیا۔ پھر بٹیر بازی میں اُن کے سامنے کون ٹھہرتا! لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا۔ اب یہ ایک صف شکن اُن کے وقت کا باقی رہ گیا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ اُن کی وفات کو کوئی بیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ بس یہ سمجھئے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا، دو کم یا دو اوپر۔ مگر اِس

بڑھوتی وقت بھی وہ ہڈّے موٹھرّے ہیں کہ مرغ کو لپک کر لات دے تو وہ بھی چیں بول جاوے۔ جیسے باز اور پدّے کی لڑائی۔ پار سال کی دل لگی سُنئے۔ نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے۔ اُن میں بھی ریاست کی بوُ ہے۔ بٹیر بازی کا بھی پرلے سرے کا شوق ہے۔ آپ کا ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے۔ آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا مدّت سے شوق ہے۔ کروڑوں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے، مگر صف شکن سا بٹیر تو حضور نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

ماموں۔ ہونھ! اس کی اصل و حقیقت کیا ہے! ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھُل جائیں۔ عقل کے ناخن لیجئے۔ بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنی آپ کو نوک دُم باہر کردے۔ حوصلہ ہو تو منگواؤں۔

نواب۔ اچھا ماموں جان! پھر کل ہوجائے۔ دو دو چونچیں تو ہوں۔

ماموں۔ کیا مضائقہ۔ مگر اپنا بٹیر آپ مفت میں کٹوائیں گے۔

"الغرض دوسرے دن پالی ہوئی۔ ہزاروں آدمی

جوق جوق آن موجود۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکہ کی جنگ ہے۔ ظفر پیکر اِس ٹھاٹھ سے آیا کہ زمین ہِل گئی۔ اور میرا تو کلیجا دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اُس دن آبرو رکھ لی۔ جب ہی تو نواب صاحب اِس کو بچوّں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے اِس کو دانہ کِھلوا لیتے ہیں پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ بھئی یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے۔ اور سچ تو یوں ہے کہ اِس نے اُس دن نواب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ جو کہیں گھٹ جاتا تو بندا تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جگ میں آبرو ہی آبرو تو ہے۔ اور ہے کیا! خیر صاحب! جیسے ہی دونوں چکھی کھا چکے ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مروڑیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر۔ سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب کا اُس دم چہرا فق ہو گیا اور کلیجا شق۔ مُنھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ نصیبِ اعدا زہر کھانے کا وقت پہنچا کہ اتنے میں صف شکن قلفی کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر، خوب پھرا۔ پالی بھر میں آواز گونجنے لگی کہ

او ہو ہو! وہ مارا ہے۔ ہاں بیٹے! دے بڑھ کر لات۔ ایک ایسی لات جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر دیا۔ منہ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اُچک کر ایک جھنجھوٹی بتائی۔ واہ واہ وا! اُسی مقام پر ایک لات اَور کس کر۔ اہو ہو ہو! شاباش! واہ پٹھے! اہو ہو ہو!! اسی جگہ ایک اور۔ اہو ہو ہو! لگا ایک اَور مڑدڑی!! اہو ہو ہو!!! اتنے میں میاں ظفر پیکر فیچ کرکے نوک دُم پالی باہر۔ پھُر سے اڑ گیا۔ پالی بھر نے کہا وہ بھگایا!! وہ مارا! چوطرفہ ٹوپیاں اُچھل گئیں۔ واہ رے صف شکن! ظفر پیکر گھٹ گیا تو صف شکن کا دل اَور بھی بڑھا۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔"

میاں آزاد نے دیکھا کہ نواب کا ہزارہا روپیہ بٹیروں کے پھیر میں ناحق گھوما جاتا ہے۔ ذہن کے پکّے تو تھے ہی، سوچے کہ آؤ آج اِن سب کو اُڑا دیں تو اچھّی دل لگی ہو۔ یہ سوچتے ہی مصاحب سے کہا کہ یار! آج اچھّی سی افیون گھول کر پلاؤ تو ہم بھی بسم اللہ کر دیں۔ مصاحب کی باچھیں کھِل گئیں کہ اچھّے کو چیلا کیا۔ دوڑتے ہوئے گئے کہ افیون گھول کر لائیں۔ اِدھر میاں آزاد نے میدان خالی پاکر کابکوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔

بٹیر سب پھُر سے بھاگ گئے۔ صف شکن کو اُنھوں نے چھُپا لیا۔ باقی سب ہوا میں موجیں لے رہے ہیں۔ ہائے، ترے کی! گھر بھر میں کتاب کا نام نہیں۔ کاغذ، قلم دوات سے کام نہیں۔ ہمیں کا یک اور بٹیر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لو بچّہ اور پالو بٹیر!

(فسانۂ آزاد، جلد اوّل)

سوالات

۱۔ آزاد نے تمام بٹیروں کو کیوں اُڑا دیا؟ اُنھوں نے مصاحب کو کس طرح ٹالا؟۔

۲۔ اس قصّہ کو سلیس اور سادہ زبان میں لکھئے۔

۳۔ پالی، چکھی کھانا اصطلاحیں ہیں۔ اس قسم کی اور جو اصطلاحیں سبق میں ہیں انھیں چُن کر لکھئے۔

۴۔ مُندرجۂ ذیل محاوروں کو جُملوں میں استعمال کیجئے۔
گھُٹ جانا، نہال کر دینا، عقل کے ناخن لینا، ہوائیاں چھوٹنا
ٹوپیاں اُچھلنا، باچھیں کھلنا،

شبلی

شبلی ضلع اعظم گڈھ (یو،پی) کے ایک گانو بندول میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت عین اُس دن ہوئی جس دن باغیوں نے اعظم گڈھ پر قبضہ کیا اور ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ کر بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔ شبلی بہت ذہین تھے۔ اُنھوں نے ۱۹ برس کی عمر میں تعلیم کی تکمیل کرلی اور اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حج سے بھی مُشرّف ہو آئے۔

۱۸۸۳ء میں شبلی علی گڈھ کالج میں عربی و فارسی پڑھانے پر مامور ہوئے اور یہیں سے اُن کی تصنیفی زندگی شروع ہوئی ہی۔ ۱۸۹۸ء میں سید کی وفات کے بعد وہ اعظم گڈھ چلے آئے۔ کچھ دنوں بعد ناظمِ محکمۂ تعلیم کی حیثیت سے حیدرآباد گئے۔ وہاں سے چلے آنے کے بعد اپنا زیادہ وقت

ندوۃ العلماء کے کاموں میں صرف کرنے لگے۔ ایک عرصہ تک ندوہ کی مخلصانہ خدمت کرنے کے بعد وہاں سے مستعفی ہو گئے اور اپنے وطن اعظم گڈھ میں بیٹھ کر اپنی آخری تصنیف "سیرۃ النبی" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ افسوس کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر پائے۔ کچھ دنوں کی علالت کے بعد ۱۶ ر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا۔

شبلی کی تحریروں میں صفائی، سادگی، سلاست روانی اور زور ہوتا ہے۔ وہ فارسی الفاظ اور ترکیبیں نہایت عمدگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں لطیف تشبیہیں اور استعارے بھی ہوتے ہیں وہ الفاظ کا بے جا استعمال نہیں کرتے اور نہ دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کا گھروندا بناتے ہیں۔ انتخاب الفاظ کی خوبی اور جملوں کی ساخت کی عمدگی کے علاوہ اُن کے یہاں لطافتِ خیال، دقّتِ نظر، اصابتِ رائے، وسعتِ تحقیق اور قوتِ استدلال پائی جاتی ہے۔

سرسید کی طرح شبلی نے بھی اپنے اثر اور اپنی تربیت سے بہت سے اعلا درجہ کے مصنّف، انشا پرداز، اور سخن دان و سخن سنج پیدا کئے۔ سید سجاد حیدر یلدرم، خواجہ غلام الثقلین، خوشی محمد خاں ناظر، ظفر علی خاں، عبدالحق، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی یہ تمام حضرات شبلی کے تربیت یافتہ ہیں۔ اِن میں ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کی شبلی نے خاص طور پر تربیت کی تھی۔

شبلی کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

سیرۃ النبیؐ (۲ جلدیں)، الفاروق، المامون شعرالعجم، موازنۂ انیس و دبیر،

ان کے مضامین کا مجموعہ مقالاتِ شبلی کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

شاعری

شعر (جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہی) ایک قسم کی مصوّری یا نقالی ہی۔ فرق یہ ہی کہ مصوّر صرف مادّی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہی، بخلاف اِس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہی۔

ایک شخص کا عزیز دوست جُدا ہو رہا ہی۔ اس حالت میں جو اُس پر صدمے گذرتے ہیں اور دل دوز خیالات کا جو طوفان اُس کے دل میں اُٹھتا ہی شاعر اُس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہی کہ اگر رنج و غم مادّی چیزیں ہوتیں اور ان کی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی۔

اِس بناء پر کسی چیز کا بیان جب اِس طرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ دریا کی روانی، جنگل کا سنّاٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے

دھوپ کی شدت، گرمی کی طپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دل آویزی یا رنج، غم، غیظ، غضب، جوش، محبت، افسوس، حسرت، خوشی، اِن اشیا کا اِس طرح بیان کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے یہی شاعری ہے۔

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

دُنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں خواہ مادّی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ، دریا وغیرہ خواہ غیر مادّی مثلاً وصل، ہجر، تحسین، نفرین اِن سب سے دل پر اثر پڑتا ہے، اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے۔ لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں۔ بعض اشخاص پر کم بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو شخص اِن مناظرِ قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہٖ اُس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے۔

شاعر کے جذبات اور احساسات فطرۃً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے، لیکن شاعر اِس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے۔ دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے، لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت

طاری ہو جاتی ہی۔ سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہی، لیکن شاعر جھومنے لگتا ہی۔ ممکن ہی کہ اِس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اِس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اُس طرح ادا نہیں کر سکتے جس طرح شاعر کر سکتا ہی۔ حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہرِ قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متأثر ہو اور اُس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کر سکتا ہو وہی شاعر ہی۔

برادرِ عزیز مولوی حمید الدّین نے جمہرۃ البلاغتہ، فنِ بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہی۔ اُس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہی۔ اُس کا خلاصہ ذیل میں ہی۔

"شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور کے ہیں۔ شعور اصل میں اِحساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں، یعنی شاعر وہ شخص ہی جس کا اِحساس قوی ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں، مثلاً رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا، یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکات صادِر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں، ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہی، انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہی۔

شاعر کی طبیعت پر رنج یا غصہ یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہی، اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی۔ اسی کا نام شاعری ہی۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ۔ اسی طرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، اور جس طرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً طاؤس ناچنے لگتا ہی، سانپ جھومتا اور لہراتا ہی، اُسی طرح انسان کو چونکہ نُطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوتا ہی اس لئے موزوں الفاظ منہ سے نکلتے ہیں اور ساتھ ہی انسان غُنغُنانے بھی لگتا ہی اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہوجاتا ہی تو انسان ناچنے لگتا ہی۔ یہ سب باتیں جمع ہوجائیں تو یہی اصلی شعر ہی۔ اس بیان سے ظاہر ہوگا کہ شعر الفاظ، وزن، نغمے اور رقص کے مجموعہ کا نام ہی۔

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کی کمالِ شدّت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں۔ تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ وزن جو

شعر کا ایک ضروری جزو ہے۔ راگ کی ایک قسم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر پڑھتے تھے۔ شعر کے پڑھنے کو جو اہلِ عرب انشاد کہتے ہیں اُس کی یہی وجہ ہے کیونکہ انشاد کے اصلی معنی گانے کے ہیں۔"

(شعر العجم، حصّۂ اوّل)

سوالات

۱۔ شبلی کی رائے میں شاعری کی کیا تعریف ہے؟
۲۔ شبلی کے نقطۂ نگاہ سے شاعر کسے کہتے ہیں؟
۳۔ شاعر اور مصوّر میں کیا فرق ہے؟
۴۔ یہ کیوں کہا گیا کہ "شعر الفاظ، وزن، نغمے اور رقص" کے مجموعہ کا نام ہے؟

عبدالحلیم شرر

عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اعلا تعلیم لکھنؤ کے بعض علماد اور ادیبوں سے حاصل کی۔ طِب بھی پڑھی تھی لیکن طبابت کو پیشہ نہیں بنایا۔ ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

شرر ایک ناول نویس کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے تاریخی کتابیں اور ادبی مقالے بھی لکھے ہیں۔ اُردو زبان میں سب سے پہلے تاریخی ناول شرر ہی نے لکھے۔

شرر ایک بہت کامیاب انشا پرداز تھے۔ اُن کی انشا میں انگریزی انشا پردازی کی جھلک نظر آتی ہی۔ ان کے ادبی مقالوں میں نظم کا حُسن اور لطافت پائی جاتی ہو۔ انسانی جذبات کی تصویر وہ نہایت خوب صورتی اور چابک دستی سے کھینچتے ہیں۔

شرر کی کتابوں کی تعداد سَو سے کچھ اوپر ہی۔

ان میں تاریخ، تاریخی ناول، تخئیلی ناول، ڈرامے اور ادبی مقالے شامل ہیں۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف رسالے بھی جاری کئے تھے۔ اُن میں دل گداز خاص طور پر مقبول ہوا۔

شرر کی بعض مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

تاریخ سندھ، فردوسِ بریں، فلورا فلورنڈا، منصور موہنا ایّام عرب، جویائے حق، مقالاتِ شرر، وغیرہ۔

رنج و الم

دُنیا میں دو چیزیں ہیں، ایک راحت، دوسرا رنج۔ اِن دونوں میں ہمیشہ مقابلہ ہوتا آیا ہے۔ عقل و نفس کے دل چسپ مباحثے تو سبھی کو یاد ہوں گے مگر رنج و راحت کی روزانہ لڑائیاں بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ راحت اپنے زبردست مددگار جوانی کو لاتی ہے، اور رنج بڑھاپے کو لاکر اُس کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر یہ کس غضب کا نحیف الجثّہ بڈّھا ہے کہ ہمیشہ جوانی پر غالب آجاتا ہے۔ باغِ ہستی عام طور پر ایک عشرت کی بہار

کا مزا اُٹھواتے اُٹھواتے کسی خزاں کے ذریعہ سے انتہائے افسردگی کا
سماں دکھلا دیتا ہے۔

مگر راحت کچھ ایسی جلد بازی اور سُرعت کو کام میں لاتی
ہے کہ جب اُسے دیکھا ہے پہلے ہی آتے دیکھا ہے، اور غم آخر میں آکر
ساری بزمِ عشرت کو برہم کر دیتا ہے۔ اِسی لئے دیکھئے ہر کسی کا پیدا
ہونا نمونۂ راحت ہے اور مرنا نمونۂ رنج۔ پوری خوشی سے انسان کی
ابتدا ہوتی ہے اور دُنیا کی چند روزہ عُمر راحت و غم کے اختلافات
اور جنگ و جدل کا زمانہ ہے۔ خوشی چاہتی ہے کہ میں اپنا وہی
اگلا سا رنگ جمائے رہوں، اور رنج کہتا ہے کہ باغِ ہستی کی سیر
اور یہ آرزو کہیں پوری ہو سکتی ہے؟ لاکھ سنبھلنے کے ارادے ہوں
مگر جب میں بھی سنبھلنے دوں! یہاں تک کہ آخر کو اِس لڑائی
میں رنج ہی کے ہاتھ میدان رہتا ہے اور موت نصیب ہوتی ہے
جو تمام خوشیوں کا خاتمہ ہے اور رنج ہی رنج رہ جاتا ہے۔ پوری
خوشی اُسی روز تھی جس روز پیدا ہوئے تھے اور پورا رنج اس روز
ہوگا جب مریں گے۔

مگر کیا غم بالکل بُری ہی چیز ہے؟ اصل تو یوں ہے کہ یہ ساری
خوشی رنج ہی کی بدولت ہے۔ جس روز رنج دُنیا سے اُٹھ جائے اُسی

روز خوشی کا خاتمہ ہے۔ قاعدہ یہی ہی کہ کسی چیز کے ہونے کی جب ہی آرزو ہوگی جب نہ ہونے کا کھٹکا ہو۔ آفتاب کا چمکدار چہرا اِسی لئے بھلا معلوم ہوتا ہی کہ چار پہر اُس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ صبحِ وطن جب ہی خوش نما معلوم ہوگی جب سالہا سال ستارم غُربت میں گذری ہو۔ اچھّی غذا میں کچھ جب ہی خوب مزا آتا ہی جب بہت دنوں کے بعد نصیب ہوئی ہو۔ جہاں دیکھئے وہی خوشی لُطف دکھاتی ہی جو رنج کے بعد حاصل ہو۔ اور یوں تو اگر ہمیشہ ایک حال پر رہے وہ عیش و عشرت بھی تو بیرن ہو جاتی ہی۔

اِسی لئے کہتے ہیں کہ خوشی اُنھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہی جو مدّتوں سرد مہری زمانہ کا مزا اٹھایا کئے ہیں۔

جو لوگ بچپن سے ناز و نعمت میں پلا کئے ہیں وہ کیا جانیں کہ سچّی راحت میں کیا مزا ہی۔ یہ تو اُن ہی سے پوچھئے جن کی زندگی بلاکشی میں گذری ہو۔ رنج رنج ہی تو خوشی سے، خوشی خوشی ہی تو رنج سے۔

ہمارا مذہب ہی کہ آدمی کبھی خوشی میں رنج کو نہ بھولے اور رنج میں خوشی سے مایوس نہ ہو۔ دونوں کا جوڑا برابر ہی۔

مُبتلایانِ غم سمجھ لیں کہ راحت کا جیسا مزا اُن کو ملے گا کسی کو نہیں مل سکتا۔ غم فروشانِ بزمِ عشرت ڈرتے رہیں کہ آگے چل کر جیسا غم انھیں جھیلنا پڑے گا کسی نے کاہے کو جھیلا ہوگا، اور سب سے بڑا غم وہی ہی جو عیش و عشرت کے بعد ہو۔ اِس کی پیروی کریں تو دیکھیں کس مزے میں رہتے ہیں۔ نہ غم کیشوں کو ایسی مایوسی ہوگی اور نہ عشرت گُزینوں میں ایسی فرعونیت آنے پائے گی۔ (مقالاتِ شرر)

سوالات

۱۔ رنج و راحت کس طرح ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں؟

۲۔ خوشی اور رنج میں کیا کشمکش جاری رہتی ہی؟ اس کشمکش کا مقابلہ کس طرح ہوتا ہی؟

۳۔ "ساری خوشی رنج ہی کی بدولت ہی" مُصنّف نے اس دعوے کے ثبوت کیلئے کون کون سی مثالیں دی ہیں؟

۴۔ مُصنّف 'مبتلایانِ غم' اور 'غم فروشانِ بزمِ عشرت' کو کیا مشورہ دیتا ہی؟

۵۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہی ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہی رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اس پر دس یا بارہ سطروں کا ایک پیراگراف لکھیے۔

آغا حشر

آغا حشر کا نام محمد شاہ تھا۔ اُن کا خاندان شال کی تجارت کے سلسلہ میں کشمیر سے بنارس آیا اور یہیں آباد ہوگیا۔ اُن کی تعلیم مشرقی طریقہ کے مطابق ہوئی۔ کسی اسکول یا کالج میں اُنھوں نے تعلیم نہیں پائی۔

آغا حشر بے انتہا ذہین تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُنھوں نے اپنے وسیع مطالعہ اور طبعی ذہانت کی وجہ سے ڈراما نویسی میں کمال حاصل کیا۔

وہ ایک بہت اچھے مقرّر بھی تھے۔ اُن کی آتش بیانی سرد سے سرد دل کو بھی گرما دیتی تھی۔

حشر ایک بلند پایہ ڈرامہ نویس بھی تھے۔ اور ایک اچھے شاعر بھی۔ ان کی نثر میں شکوہ، روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُن کی تشبیہیں اور

استعارے بہت نادر ہوتے ہیں۔ وہ خصوصیت
کے ساتھ اُس وقت بہت کامیاب رہتے
ہیں جب دو متضاد کیرکٹروں میں مکالمہ کراتے
ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں جذبات کی لطافت کے
بجائے اکثر شدّت پائی جاتی ہے۔

حشؔر نے ۱۹۳۶ء میں لاہور میں انتقال
کیا۔

حشؔر کے بعض مشہور ڈرامے یہ ہیں:۔
دل کی پیاس، ترکی حور، خوب صورت بلا
رستم و سُہراب، عشق و فرض، وغیرہ۔

عشق و فرض

ایک سین

میدانِ جنگ کا ایک حصہ

(ہومان، بارمان اور قلعۂ سفید کے محافظ ہجیر کے ساتھ سہراب کا داخلہ۔ ہجیر کے دونوں ہاتھ کمند سے بندھے ہوئے ہیں)

سہراب۔ تم قلعۂ سفید کے محافظ ہو؟

ہجیر۔ ہاں۔

سہراب۔ تمھارا نام؟

ہجیر۔ ہجیر۔

سہراب۔ قلعہ کے حاکم کا نام؟

ہجیر۔ گستہم۔

سُہراب۔ اگر قید کی زندگی کو جس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی ہی آزاد زندگی میں بدلنا چاہتے ہو تو تنبیہہ آمیز خط لکھ کر انجام سے غافل گستہم کو آگاہ کرد کہ خوفناک مستقبل تباہی و بربادی کے جلوس میں قلعہ کے پھاٹک کے سامنے پہنچ گیا ہی۔ اِس لئے رحم و معافی حاصل کرنے کے لئے میرے حضوُر میں آکر نذرانۂ اطاعت پیش کرے۔

ہجیر۔ قُوا کے ساتھ میری قوّتِ حافظہ بھی ضعیف ہوگئی ہی۔ اِس لئے عُمر کے آخری دنوں میں غدّاری کا سبق یاد نہیں کر سکتا۔

سُہراب۔ یعنی؟

ہجیر۔ تم نے میدانِ جنگ میں شکست دے کر میرے جسم کو قید کر لیا ہی، میری رُوح تمھارے قیدوبند میں نہیں ہی۔ میرا ضمیر اور میرا جذبۂ وطن پرستی آزاد ہی اور ہمیشہ آزاد رہے گا۔ خلش و خطرہ سمجھ کر انتہائی عقوبتوں کے ساتھ قتل کر دو یا فتح کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھّو، لیکن میں لالچ سے مغلوب اور

تکلیفوں سے دہشت زدہ ہوکر اپنے ملک کی غلامی
کے کاغذ پر کبھی دستخط نہیں کروں گا۔

سُہراب۔ عقل کی شرکت میں اپنی غلط رائے پر نظرثانی کر۔
موت کے جبڑے میں ملک کو نہ جھونک۔ میری
اطاعت میں ہی تیرے اہلِ وطن کی زندگی ہی۔

ہجیر۔ زمین پر رینگتے ہوئے حقیر کیڑوں کی طرح صرف حرکت
کرنے اور سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہی۔ آزادی
اور اختیار سے محروم ہوکر پامال گھاس کے مانند جینا
انسانیت کی موت ہی۔ میری تمنّا ہی اور دعا ہی کہ
میرے اہلِ وطن جئیں، لیکن غلام بن کر نہیں آقا بن کر،
کُتّے کی طرح نہیں شیر کی طرح۔

سُہراب۔ گستہم کو خط لکھ کر تسلیم شکست کا مشورہ دینا تیری
طرف سے اِس وقت ملک کی سب سے بڑی
خدمت تھی۔ تیرے انکار نے ثابت کردیا تو
سخت بے وقوف ہی۔

ہجیر۔ ملک کے نمک حراموں کو ملک کے دشمن بھی
اِحترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ میں بے وقوف

کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن اپنے بے داغ، معزز نام کے ساتھ دغاباز اور قوم فروش کے خطاب کا اضافہ نہیں چاہتا۔

سُہراب۔ اچھا تو اب میرے غضب کی ہولناکیوں کو رحم کا الزام نہیں دے سکتا۔

(ہومان و بارمان سے)

خوں ریزی و تباہ کاری کے مقید دیوؤں کو زنجیریں کھول کر قلعۂ سفید پر حملہ آور ہونے کے لئے آزاد کردو، اور غم کی سیاہ رات میں برباد شدہ وطن کے تودۂ خاک پر اُلّو کی طرح ماتم کرنے کے لئے اِس بدبخت کو قید میں رکھو۔ لے جاؤ! یہی ناشکرگزاری کی کم ازکم سزا ہے۔

(ہومان و بارمان ہجیر کو لے جاتے ہیں)

(تجلّیاتِ حشر)

سوالات

۱۔ سُہراب نے ہجیر کو کیا حکم دیا؟

۲۔ ہچپر نے اس کی تعمیل سے کیوں انکار کیا؟

۳۔ ہچپر نے بے وقوف کہلانا کیوں پسند کیا؟

۴۔ مندرجۂ ذیل جملوں کو سلیس اردو میں لکھئے؟

قوا کے ساتھ .... یاد نہیں کر سکتا۔

عقل کی شرکت میں .... اہل وطن کی زندگی ہے۔

خوں ریزی و تباہ کاری .... قید میں رکھو۔

عبدالحق

مولوی عبدالحق ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ ہاپڑ کے رہنے والے ہیں وہ علی گڈھ کالج کے پہلے دور کے طلبا میں سے ہیں۔ ریاست حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم میں ایک زمانہ تک کام کرنے کے بعد پنشن لی اور اپنا سارا وقت اُردو زبان کی توسیع و اشاعت میں صرف کیا۔ وہ ایک عرصہ تک ہندوستان کی مشہور انجمن ترقیٔ اُردو کے سکریٹری رہے۔ اب وہ پاکستان کی انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر ہیں۔

عبدالحق اُردو زبان کے بہت بڑے مُحقّق ہیں۔ اُن کو اِس زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اُن کی تحریروں میں بے حد سادگی صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ لیکن سادگی

کے ساتھ عبارت میں زور بہت ہوتا ہے۔ وہ فارسی اضافتوں کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ ہندی الفاظ اپنی عبارت میں بڑی خوبی سے کھپاتے ہیں۔ وہ ایک اونچے پائے کے نقاد بھی ہیں۔

عبدالحق کی بعض مشہور تصانیف یہ ہیں:
قواعد اُردو، چند ہم عصر، خطبات عبدالحق،

اُردو کی مقبولیت کے اسباب

سب سے بڑی وجہ اِس کی مقبولیتِ عام کی یہ ہوئی کہ اِس کی بنیاد عوام کی زبان پر رکھی گئی تھی جو بول چال کی زبان تھی۔ خود اُردو کا لفظ ہی اِس کی اصل اور ابتدا کا پتا دیتا ہے۔ اِس وقت جتنی شائستہ اور اعلا درجہ کی زبانیں ہیں جن کی دھاک ساری دُنیا پر بیٹھی ہوئی ہے وہ ایک وقت میں عوام کی معمولی بولیاں تھیں اور حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی

تھیں، یہاں تک کہ خود اہلِ زبان اُس میں لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حال پہلے پہلے اُردو کا بھی تھا۔ اِس کے بولنے والے بھی اِس میں لکھتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ لیکن آخر یہی عوام کی بولی رفتہ رفتہ شائستہ اور ادبی زبان بن گئی اور اب تک اِس کا تعلق برابر عوام کی بولی سے رہا۔ ادبی زبان بننے پر بھی، وہ عوام کی بولی سے جُدا نہیں ہوئی۔ عوام کی زبان بمثل قلب کے ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور اُن کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے اور جس وقت سے اُس کا تعلّق عوام کی بولی سے منقطع ہو جاتا ہے اُسی وقت سے اُس پر مُردنی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یونانی، سنسکرت، لاطینی جو دُنیا کی کامل اور بہترین زبانیں خیال کی جاتی ہیں اِسی لئے مُردہ ہو گئیں۔

البتہ اُردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شُعرا نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا اور اُن کی بجائے عربی فارسی کے لفظ بھرنے شروع

گئے، اور یہی نہیں بلکہ بعض عربی، فارسی الفاظ جو بہ تغیرِ ہیئت یا بہ تغیرِ تلفظ اُردو میں داخل ہو گئے تھے انھیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "اصلاحِ زبان" رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلّف اور تصنّع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے۔ شاعری ضلع جگت ہو گئی تھی۔ سخن وروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اُس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا، اُن میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا، قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ دینا رہ گیا تھا۔ اِس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ برنگ لفظوں کا ایک ڈھانچا تھی جس پر طرح طرح کی نقّاشی کی ہوئی تھی، لیکن اُس میں جان نہ تھی، اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہو گئی تھی کہ اُسے بہت کم انسان بولتے تھے۔ غرض اِس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان، بے لُطف اور بے اثر بنا دیا تھا۔

لیکن یہ دورِ تاریکی چند روزہ تھا۔ اِس

کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سیّد احمد خاں نے کیا۔ اُس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ اگرچہ اُس کی زبان اور اُس کا اندازِ بیان سادہ تھا لیکن اُس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی، اُس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا اور موافق و مخالف دونوں نے اُس کی پیروی کی اور اُس کے رفقا یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی اور ذکاءاللہ خاں وغیرہ نے اُسے اور چمکایا اور بڑھایا۔

اُردو کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو قابلِ غور ہی۔ جس وقت یہ زبان وجود میں آئی تو ملک میں جتنی بولیاں مُروّج تھیں وہ سب اپنے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور حلقوں میں محدوٗد تھیں یہ زبان قدرت سے ایسے ماحوٗل اور ایسے حالات اور اس قسم کے اثرات کے تحت بنی تھی اور اِس طرح سے اِس کی ترکیب عمل میں آئی تھی کہ وہ خود بخود ملک کے اکثر خطّوں میں پھیلتی گئی اور لوگ اُسے قبول کرتے چلے گئے۔ ملک میں کوئی دوسری بولی یا زبان

ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کرتی ۔اور جتنی بولیاں یا زبانیں تھیں وہ اپنے حلقے سے باہر نہ بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہی کہ جب اہلِ یورپ اور خصوصاً انگریز اِس ملک میں آئے تو انھوں نے اسے ہندُستانی یعنی ہندُستان کی زبان سے مؤسوم کیا، اور یہی وجہ ہی کہ جب فارسی کی بجائے اُردُو سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی تو کسی نے اِختلاف نہ کیا۔ اِختلاف ہوتا تو کس بنا پر؟ کوئی دوسری زبان ایسی تھی ہی نہیں جو ہندوستانی ہونے کا دعوا کرتی۔

اُردُو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہی جس پر بہت کم توجّہ کی گئی ہی۔ وہ عورتوں کی زبان ہی۔ یوں تو دُنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہی لیکن اُردُو زبان میں یہ اِمتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہی۔ اُردو نے جس خِطّہ میں جنم لیا یا جہاں جہاں اُس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردے کی رسم رائج رہی ہی۔ اِسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کے الفاظ اور محاورے

اور اُن کا طرزِ بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہوگئی
عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ انسانوں یا چیزوں
میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی
ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی
وجہ سے اُن کا سارا وقت اُمورِ خانہ داری، بال بچوں
کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج
کی پابندی اور اُن کے متعلق جتنے معاملات ہیں اُن
میں صرف ہوتا ہے اور اِس اقلیم میں اُن کی عمل داری
کامل ہوتی ہے۔ پھر اُن کی زبان اور لہجے میں قدرتی
لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے۔ اِس لئے انھوں نے
اپنے تعلّقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ،
محاورے اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک
خوب صورت اور نُکیلے ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں
نے بنائے ہیں بہت ہی پُر لُطف اور دل کش ہیں
اور نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔
ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بد تمیزی سمجھا جاتا
ہے یا جن کے کہنے میں شرم و حجاب مانع ہوتا ہے،

عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرائے یا تشبیہہ اور استعارے کے رنگ میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفّظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا وہ اُنھیں بہت سڈول بنا لیتی ہیں۔ بعض اوقات اُن کے معنی تک بدل جاتے ہیں اور وہ خالص اُردو کے لفظ ہوجاتے ہیں۔ ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں، یا عربی فارسی کے لفظ ہیں تو اُنھیں ایسا تراشا ہے کہ اُن میں اُردو کی چمک دمک پیدا ہوگئی ہے۔ اب جدید حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے۔

(خطبات عبدالحق، جلد اوّل)

سوالات

۱۔ اُردو کی مقبولیت عام کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟

۲۔ "اصلاح زبان" کے زمانہ کو عبدالحق نے دورِ تاریکی کیوں کہا ہے؟

۳۔ سرسید کی کوششوں کا اُردو زبان پر کیا اثر پڑا؟

۴۔ مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کیوں فرق ہے؟ اس فرق کا اُردو زبان پر کیا اثر پڑا؟

برج نرائن چکبست

برج نرائن چکبست کشمیری پنڈت تھے۔ لیکن اُن کے آباء و اجداد نے ایک عرصہ سے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم اور نشوونما لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد چکبست لکھنؤ کے مشہور کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ بی۔اے کرلینے کے بعد ال ال بی کی ڈگری لی، اور لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کردی۔ ۱۹۲۶ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں بریلی گئے۔ واپسی میں اسٹیشن پر فالج کا اثر ہوا اور چکبست ہمیشہ کے لئے اِس دُنیا سے رخصت ہوگئے۔

چکبست اُردو زبان و شاعری کے بہت دل دادہ تھے۔ اُن کا شمار دورِ جدید کے

ممتاز شعرا اور نثاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے کلام میں صفائی، سادگی اور ایک ترنّم آمیز روانی پائی جاتی ہے۔ اُن کی بندشِ الفاظ بہت چُست ہوتی ہے۔ وہ میر انیس سے بہت مُتاثّر تھے۔

چکبست کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اُن کی عبارت نہایت متین اور شُستہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے مطالب بہت صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ طرزِ ادا میں دل کشی اور عبارت میں سلاست کے ساتھ رنگینی بھی ہوتی ہے۔ وہ ایک اچھے نقّاد بھی تھے۔

ان کے مضامین کا مجموعہ مضامینِ چکبست کے نام سے اور نظموں کا مجموعہ صبحِ وطن کے نام سے چھپ چکا ہے۔

تاریخ

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اُصول ہے کہ دُنیا میں جس قدر رسم و رواج یا علوم و فنون ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقّی سے ظہور میں آئے ہیں۔ فنِّ تاریخ بھی اس حالت سے مستثنا نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانہ تک یہ فن تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دُنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گذرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اُس کے لئے مُعمّے سے کم نہ تھے۔ اس عالمِ حیرت میں اُس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گذرتے تھے وہ اُس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے، مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہیں کبھی

راتیں۔ کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں، کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کرجاتی ہے۔ ان انقلابات سے متأثر ہوکر وہ دُنیا کی کیفیت تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں اُن کی گفتگو تشبیہہ اور استعارے کے پیرائے میں ہوا کرتی ہے، مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہوگا کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے تو وہ یہ کہے گا کہ اُس کے گھر کی پتّیاں میرے گھر میں اُڑ کر آتی ہیں۔ چنانچہ زمانۂ گذشتہ میں بھی وحشی قوموں کا یہی رنگ تھا۔ اِس قسم کے گیت یا نظمیں ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ میں موجود ہیں جن میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں جو کہ انسان کے دل میں ابتدائی تہذیب میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ مثلاً وہ سیاروں کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے، دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت و شوکت سے

متاثر ہوکر اُن کی پرستش کرتا ہی اوٗر جب اُس کے جذباتِ دلی جوش میں آتے ہیں تو وہ اُن خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہی جو کہ نظموں یا گیتوں کی شکل میں یاد رہ جاتے ہیں، اوٗر آئندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہیں جس سے اُس وقت کی تہذیب اوٗر ترقّی کی حالت آئینہ دار نظر آتی ہی۔

دوٗسری منزل میں اِس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی۔ جب کہ انسان ترقّی کے میدان میں دس قدم اوٗر آگے بڑھا اُس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہوٗر میں آئیں۔ اُس حالت میں تاریخ صرف اُن جذبات و عقائدِ انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل میں محض قُدرت کے عظیم الشّان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے، بلکہ اُس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا۔ لیکن یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کئے گئے۔ ہر روایت کے

بیان میں خیالی عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اُس دوَر میں پیدا ہوئے اُن کی تعریف میں بہت سی داستانیں کہی گئیں۔ کچھ نظم میں کچھ نثر میں۔ یہ فنِ تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے۔

تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حِس پیدا ہوئی۔ ابھی تک اُس کا منشا محض جذباتِ دلی کا اظہار تھا یا بزرگوں کی عظمت کرنا، نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اُس نے گذشتہ و موجودہ واقعات کو ایک جا جمع کرنا شروع کیا۔ لیکن یاد رہے کہ اُس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہیں پہنچ گیا تھا۔ اُس زمانے کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں نہ کہ مُلک اور سوسائٹی کی حالت کی فلسفیانہ تفسیریں۔

اب فنِ تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقّی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہیں رہا تو اُس نے واقعات

کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا، بلکہ اُن
کی رفتار کا بہ حیثیتِ مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا، عام
اسباب سے عام نتائج اخذ کئے اور اُن عام نتائج کی مدد
سے چند عام اصول قائم کئے اور اُن عام اصولوں کو
کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی
نگاہ ڈالی۔ اِس دماغی ترقّی کے ساتھ نظامِ معاشرت
کی سادگی میں بھی روز بروز فرق آتا گیا اور زندگی
کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی۔ اِس حالت میں تاریخ جب
لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ
اُن واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح
ہوگئی۔ رفتہ رفتہ فنِّ تاریخ ترقّی کرتا گیا اور آخرکار
تجربے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فنِّ تاریخ شاعری اور
فِلاسفی کا مجموعہ ہے، یعنی مورّخِ کامل وہی شخص ہوسکتا
ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصوّر کا قلم رکھتا ہو۔ دماغ
سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازا کرے اور
جادوکار قلم سے سوسائٹی کے اندازِ معاشرت کی تصویر
کھینچے۔ (مضامینِ چکبست)

سوالات

۱۔ ابتدائی تہذیب میں انسان کے دل میں کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے تھے اور وہ ان کا اظہار کس طرح کرتا تھا؟

۲۔ دوسری منزل میں پہنچ کر فن تاریخ نے کیا نئی صورت اختیار کرلی؟

۳۔ تیسری منزل میں تاریخ کا کیا انداز تھا؟

۴۔ چوتھی منزل میں اس کی کیا صورت ہوگئی؟

پریم چند

پریم چند کا اصلی نام دھن پت رائے تھا
بنارس کے رہنے والے تھے۔ رسم زمانہ کے مطابق
ان کی تعلیم کی ابتدا اُردو فارسی سے ہوئی۔ پھر
انگریزی شروع کی۔ بنارس کالیجیٹ اسکول سے
انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور تعلیم کے محکمہ میں
ملازمت کرلی۔ کچھ عرصہ بعد پرائیوٹ طور پر
بی، اے کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ ۱۹۲۰ء میں عدم
تعاون کی تحریک کے زمانے میں وہ اپنے عُہدے
سے مُستعفی ہو گئے۔

پریم چند کا درجہ اُردو افسانہ نگاری میں
بہت بلند ہے۔ وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں
نے صحیح معنوں میں ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔
اُن کے کردار جن اور پریاں نہیں بلکہ گوشت

پوست کے انسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمیشہ یہ دکھاتے ہیں کہ انسان کی فطرت نہ بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ۔ نہ وہ مجسّم شیطان ہوتا ہے نہ فرشتہ۔ بلکہ اُس میں خوبیاں اور بُرائیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ انسان کو اچھا یا بُرا بنانے والے در اصل اُس کے گرد و پیش کے حالات ہوتے ہیں۔

پریم چند کی سب سے نُمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیہاتی زندگی کی تصویر نہایت عمدگی سے کھینچتے ہیں۔ وہ در اصل پہلے قصہ نویس ہیں جنھوں نے ادب میں دیہات اور دیہات کی زندگی کو داخل کیا کسانوں کی زبوں حالی، زمین داروں، بنیوں اور پولیس والوں کے مظالم کی داستانیں وہ نہایت خوبی کے ساتھ سُناتے ہیں۔

پریم چند کا طرزِ بیان بھی نہایت عُمدہ ہے۔ اُن کی عبارت بہت صاف، سلیس اور رواں ہوتی ہے۔ سادگی میں جوش پیدا کرنا پریم چند کا حصّہ ہے۔

اُن کی تشبیہیں بہت دل کش ہوتی ہیں۔ ان کے مکالمے بھی بہت فطری اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ مزدوروں، کاشتکاروں اور نچلے طبقے کے لوگوں کے مکالمے لکھنے میں وہ خصوصیت سے بہت کامیاب رہے ہیں۔

پریم چند کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، گوشۂ عافیت، بازارِ حُسن، گئودان، بیوہ، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی زادِ راہ۔

بڑے گھر کی بیٹی

(۱)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمین دار اور نمبردار تھے۔ اُن کے بزرگ کسی زمانہ میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اِس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اب اُس ہاتھی کا نعمُ البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اُس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کی نذر کی، اور اب اُن کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکُر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سری کنٹھ سنگھ تھا۔ اُس نے ایک مُدّت دراز

کی جاں کاہی کے بعد بی۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دُہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرا، چوڑا سینا۔ بھینس کا دو سیر تازا دودھ ناشتا کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اُس سے بالکل مُتضاد تھے۔ اِن ظاہری خوبیوں کو انھوں نے دو انگریزی حروف بی، اے پر قربان کر دیا تھا۔ اِنھیں دو حرفوں نے اُن کے سینے کی کُشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقتِ فرصت طِب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدا تھا۔ شام سویرے اُن کے کمرے سے اکثر کھرل کی خوش گوار پیہم صدائیں سُنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اِس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مدّاح نہ تھے، بلکہ اِس کے برعکس وہ اکثر بڑی شدّ و مد سے اِس کی مذمّت کیا کرتے تھے۔ اِسی وجہ سے گانو میں اُن کی بڑی

عزت تھی۔ پرانے رسم و رواج کا اُن سے زیادہ پرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا، خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جُل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اُسے وہ ملک اور قوم کے لئے فالِ بدخیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گانو کی بہوئیں اُنھیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو اُنھیں اپنا دشمن سمجھتیں۔ خود اُنھیں کی بیوی اُن سے اِس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی۔ مگر اِس وجہ سے نہیں کہ اُسے اپنے ساس سسر سے یا دیور جیٹھ سے نفرت تھی، بلکہ اُس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہوسکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اُس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار

تھے۔ عالی شان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن، بہلیاں، شکاری کُتّے، فرش فروش، شیشۂ آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک مُعزّز تعلّقہ دار کے لوازِم ہیں، وہ اُن سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل، حوصلہ مند آدمی تھے۔ مگر قسمت کی خوبی! لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں اُن کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹّی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو اُنھوں نے تین شادیاں دِل کھول کر کیں، مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہوگئے تو آنکھیں کُھلیں۔ ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی، مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکُر بھوپ سنگھ اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچّے کو شاید اُس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اُس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے

کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا کہ اُسے اپنے آپ کو بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ اُن کے پاس کسی چندے کے لئے رُپے مانگنے آئے۔ بھوپ سنگھ اُن کے طور و طریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے۔ اور شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔

آنندی دیوی اپنے گھر آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھیں اُن کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا کیا، کوئی سجی ہوئی خوب صورت بہلی بھی نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھیں مگر یہاں باغ کہاں! مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اِس قدر مانوس بنالیا گویا اُس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مُرغابیاں لئے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا "جلدی سے گوشت پکادو، مجھے بھوک لگی ہو" آنندی کھانا پکاکر اُن کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی، مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی، کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اُس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے "دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"

آنندی نے کہا "گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔"

لال بہاری۔ ابھی پرسوں گھی آیا ہو۔ اِس قدر جلد اُٹھ گیا؟

آنندی۔ آج تو کُل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اُٹھتی ہو اُسی

طرح بھوک سے باولا انسان ذرا سی بات پر تُنک جاتا ہی۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بُری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا "میکے میں تو جیسے گھی کی ندی بہتی ہو!"

عورت گالیاں سہتی ہی، مار سہتی ہی، مگر میکے کی نندا اُس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی مُنھ پھیر کر بولی "ہاتھی مَرا بھی تو نو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔"

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اُٹھا کر پٹک دی اور بولا۔ "جی چاہتا ہی کہ تالو سے زبان کھینچ لوں۔"

آنندی کو بھی غصّہ آگیا۔ چہرا سُرخ ہو گیا۔ بولی "وہ ہوتے تو آج اِس کا مزا چکھا دیتے۔"

اب نوجوان، اُجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کی بیوی ایک معمولی زمین دار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا اُس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اُٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا "جس کے گُمان پر بھولی ہوئی ہو اُسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔"

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصّے کے مارے ہوا سے ہلتے ہوئے پتّے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزّت شوہر کی ذات سے ہے۔ اُسے شوہر کی طاقت اور ہمّت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اُن کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسبِ معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں، کچھ نئے مقدّمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے، اور سلسلۂ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اِضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اُٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو

لال بہاری نے کہا۔ "بھیّا! ذرا آپ گھر میں سمجھا دیجئے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں۔ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔"

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے مُنھ لگیں۔"

لال بہاری۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔

سری کنٹھ۔ آخر بات کیا ہوئی؟

لال بہاری۔ کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی آپ ہی اُلجھ پڑیں۔ میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھری بیٹھی تھی اور یہ حضرت بھی تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا "مزاج تو اچھا ہے؟"

سری کنٹھ بولے "بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور جھنجھلاہٹ

کے مارے بدن میں پسینا آگیا۔ بولی "جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اُسے پاؤں تو مُنہ جُھلس دوں۔"

سری کنٹھ۔ اِس قدر تیز کیوں ہوتی ہو؟ کچھ بات تو کہو۔

آنندی۔ کیا کہوں! قسمت کی خوبی ہے، ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراس گیری کرنے کی بھی تمیز نہیں مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں اکڑتا پھرتا۔ بوٹیاں نچوا لیتی۔ اُس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے؟

سری کنٹھ۔ آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔

آنندی۔ پرسوں تمھارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا "دال میں گھی کیوں نہیں؟" بس اِسی پر میرے میکے کو بُرا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

بس اتنی سی بات پر اُس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری۔ اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی تو سر پھٹ جاتا۔ اُس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ؟

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ بولے "یہاں تک نوبت پہنچ گئی! یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔"

آنندی رونے لگی، جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے، کیونکہ آنسو اُن کی پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصہ پر روغن کا کام کرتے ہیں۔

سری کنٹھ کے مزاج میں تحمّل بہت تھا۔ اُنھیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جاکر بولے "دادا! اب میرا نباہ اِس گھر میں نہ ہوگا۔"

یہ اور اِسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لئے سری کنٹھ سنگھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب اُن کا کوئی

دوست اُن سے ایسی باتیں کہتا تو وہ اُس کا مضحکہ اُڑاتے، اور کہتے "تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ اُنھیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود اُن کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پُرجوش وکیل آج اپنے باپ سے کہہ رہا تھا "دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہو گا۔"

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور بولے "کیوں؟"

سری کنٹھ۔ اِس لئے کہ مجھے بھی اپنی عزّت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہئے وہ اُن کے سر پر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسروں کا غلام ٹھیرا۔ گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ کڑی بات تک تو مضائقہ نہیں۔ کوئی ایک کی دو کہہ لے۔ یہاں تک میں ضبط کر سکتا ہوں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں اور

میں دم نہ ماروں۔

بینی مادھوسنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ اُن کا ادب کرتے تھے۔ اُن کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہوگیا۔ صرف اتنا بولا "بیٹا! تم عقل مند ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ عورتیں اِسی طرح گھر تباہ کردیتی ہیں۔ اُن کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں ہے۔"

سری کنٹھ۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دُعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اِس گانو کے کئی خاندانوں کو میں نے علاحدگی کی آفتوں سے بچادیا ہے۔ مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اُس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ نہیں سہہ سکتا۔ آپ یقین مانیئے، میں اپنے اوپر بہت جبر کررہا ہوں کہ لال بہاری کی گوش مالی نہیں کرتا۔

اب بینی مادھوسنگھ بھی گرمائے۔ یہ کُفر زیادہ نہ سُن سکے۔ بولے "لال بہاری تمھارا بھائی ہے۔ اُس سے

جب کبھی بھول چوک ہو تم اُس کے کان پکڑو۔ مگر...."

سری کنٹھ ۔ لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔

بینی مادھو۔ عورت کے پیچھے؟

سری کنٹھ۔ جی نہیں۔ اُس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث۔

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اِسی اثناء میں کئی اور آدمی حُقّا تمباکو اُڑانے کے لئے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سُنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں تو اُن کا دل بہت خوش ہوا، اور طرفین کی شِکوہ آمیز باتیں سُننے کے لئے اُن کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسِد بھی گانو میں تھے جو اِس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا تھا، اِس لئے وہ خطاوار ہی۔ اُس نے اتنا عِلم حاصل کیا، یہ بھی

اُس کی خطا ہے۔ بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ وہ بلا اُس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے، یہ اُن کی حماقت ہے۔ اِن خیالات کے آدمیوں کی آج اُمیدیں بر آئیں۔ حقّا پینے کے بہانے سے، کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلے سے آ آکر بیٹھ گئے۔ بینی مادھو سنگھ پُرانا آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے۔ اُس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اُنھیں خوش نہ ہونے دوں گا، خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجہ تقریر نرم کر کے بولے "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں۔ تمھارا جو جی چاہے کرو۔ اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی۔"

الہ آباد کا نوجوان جھلّایا ہوا گریجویٹ اِس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈبیٹنگ کلب میں اُس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر علمی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا۔ اِس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اُس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا "میں

لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اِس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ۔ بیٹا! تم عقل مند ہو، اور عقل مند آدمی گنواروں
کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا
ہے۔ اُس سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اُسے تم بڑے
ہو کر معاف کر دو۔

بیٹا۔ اُس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔
یا تو وہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔
آپ کو اگر اُس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے
رُخصت کیجئے۔ میں اپنا بوجھ آپ اُٹھالوں گا۔
اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اُس سے کہئے جہاں
چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر چُپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ اُن کا بہت ادب کرتا تھا۔ اُسے کبھی اتنی جُرأت نہ ہوئی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یا حُقّہ پی لے یا پان کھا لے۔ اپنے باپ کا بھی اِتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اُس سے دلی محبت

تھی۔ اپنے ہوش میں اُنھوں نے کبھی اُسے گھُرکا تک نہیں۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اُس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مُگدر کی جوڑی اُنھیں نے بنوادی تھی۔ پچھلے سال جب اُس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو اُنھوں نے خوش ہوکر اکھاڑے ہی میں جاکر اُسے گلے سے لگایا تھا، اور پانچ رُپے کے پیسے لُٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے مُنھ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سُن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اُسے ذرا بھی غُصّہ نہ آیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اُس کا دل ہردم دھڑکتا تھا کہ دیکھو بھیّا کیا کہتے ہیں! میں اُن کے سامنے کیسے جاؤں گا! میں اُن سے کیسے بولوں گا! میری آنکھیں اُن کے سامنے کیسے اُٹھیں گی! اُس نے سمجھا تھا کہ بھیّا مجھے بُلاکر سمجھادیں گے۔ اِس اُمید کے خلاف آج وہ اُنھیں اپنی صورت سے بے زار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا، مگر

اُس کا دل کہتا تھا کہ بھیّا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اُسے اکیلا بُلا کر دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اُسے اتنا ملال نہ ہوتا۔ مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اُس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں آیا اور کوٹھری میں جا کر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پوچھیں جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب، آنندی دیوی کے دروازے پر آکر بولا۔ "بھابی! بھیّا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اِس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا مُنھ دیکھنا نہیں چاہتے۔ اِس لئے اب میں جاتا ہوں۔ اُنھیں پھر مُنھ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو خطا ہوئی ہے اُسے معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہو گئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے ہوئے

آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا اُسی وقت سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور کترا کر نکل گئے، گویا اُس کے سائے سے بھی پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی، مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی اور اُس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھُنجھلا رہی تھی کہ یہ اِس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو پھر میں کیا کروں گی اُس کے چہرے کو زرد کئے ہوئے تھا۔ اِسی حالت میں جب اُس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "اب میں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو خطا ہوئی ہو معاف کرنا" تو اُس کا رہا سہا غُصّہ بھی پانی ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ۔ تو میں کیا کروں؟

آنندی۔ اندر بُلالو۔ میری زبان میں آگ لگے، میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اُٹھایا۔

سری کنٹھ۔ میں نہیں بُلانے کا۔

آنندی۔ پچھتاؤ گے۔ اُنھیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔

سری کنٹھ نہ اُٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا "بھابی! بھیّا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا مُنھ دیکھنا نہیں چاہتے، اِس لئے میں بھی اپنا مُنھ اُنھیں نہ دکھاؤں گا۔"

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "مجھے جانے دو۔"

آنندی۔ کہاں جاتے ہو؟

لال بہاری۔ جہاں کوئی میرا مُنہ نہ دیکھے۔

آنندی۔ میں نہ جانے دوں گی۔

لال بہاری۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔

آنندی۔ تمھیں میری قسم! اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔

لال بہاری۔ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ بھیّا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا یا نہیں تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔

آنندی۔ میں ایشور کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ تمھاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میَل نہیں ہے۔

اب سری کنٹھ کا دل پگھلا۔ اُنھوں نے باہر آکر لال کو گلے لگا لیا، اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لال بہاری نے سِسکتے ہوئے کہا۔ "بھیّا! اب کبھی نہ کہنا کہ تمھارا مُنہ نہ دیکھوں گا۔ اِس کے سِوا

جو سزا آپ دیں گے وہ ہیں خوشی سے قبول کروں گا۔"

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "للّو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ۔ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔"

بینی مادھو سنگھ باہر سے آرہے تھے۔ دونوں بھائیوں کو گلے ملتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو گئے، اور بول اُٹھے "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنالیتی ہیں۔"

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سُنا ان الفاظ میں آنندی کی فیّاضی کی داد دی۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

(پریم چند، حصّۂ اوّل)

سوالات

۱۔ سری کنٹھ کیوں اپنے گاؤں کے مردوں میں مقبول اور عورتوں میں نا مقبول تھے؟

۲۔ آنندی جب بیاہ کر سسرال آئی تو اسے کیسا پایا؟

۳۔ لال بہاری اور آنندی میں کس بات پر جھگڑا ہوا؟

۴۔ بینی مادھو سنگھ لال بہاری کی حمایت کر رہا تھا۔ پھر اس نے یکایک اپنا لہجہ کیوں نرم کر دیا؟

۵۔ لال بہاری نے کیوں گھر سے نکل جانے کا فیصلہ کیا؟

۶۔ آنندی نے کس طرح ثابت کیا کہ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہے؟

سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ کالج کے ممتاز طلبا میں تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ پہلے کچھ دنوں اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ رہے۔ پھر برطانوی سفارت کے ایک رُکن کی حیثیت سے بغداد گئے۔ وہاں سے واپسی پر یو، پی گورنمنٹ نے اُنھیں ڈپٹی کلکٹر نام زد کیا۔ اُس کے بعد مُسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک اِس عُہدے پر رہے۔

یلدرم کا شُمار اُردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز اِنشا پرداز ہیں۔ اُن کی اِنشا میں انگریزی کی شان فرانسیسی کی لطافت، فارسی کی شیرینی اور ترکی کی

خیال آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ نئی نئی ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔ اُن کی تشبیہیں نہایت شگفتہ ہوتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنز کی بھی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔

یلدرم کے ادبی مضامین کا ایک مجموعہ خیالستان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ "خیالستان لطیف جذبات اور نازک شاعرانہ خیالات کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے۔" ان کی بعض دوسری کتابیں یہ ہیں :-

زہرہ، آسیب الفت، ثالث بالخیر، جلال الدین خوارزم شاہ، ہما خانم وغیرہ

اگر میں صحرا نشیں ہوتا!

اگر میں صحرا نشیں ہوتا تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔ چاندنی رات میں میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دلِ عمیق میں حسیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گڈریا ہوتا۔ پُر فضا گھاٹی کے پھول اور اُن پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے والی بُلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پُر مسرت زندگی بسر کرتا۔ مگر میں شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے

گذر رہا ہی۔ ایک عالی شان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعّم اور گناہ کے سوا کچھ نہیں)، کھڑا ہو جاتا ہی۔ کھڑکیوں کو کھڑا گن رہا ہی اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہی۔ آگے چل کے ایک بڑی پُر رونق حلوائی کی دوکان کے سامنے کھڑا حسرت سے مُنھ اور آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہی۔ مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کے مُنھ میں پانی بھر بھر آتا ہی، لیکن وہ خرید نہیں سکتا۔

پھر ایک شرابی سامنے سے گذرتا ہی جس کی قوّتِ معنویہ سب محو ہو چکی ہی۔ جو جان جان کر زہر پی رہا ہی۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہی جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے اوروں کو عبرت دلانے اور اُسے آئندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے زنداں کو لئے جا رہے ہیں، گویا فلاکت و حاجت زنداں سے ڈرتی ہی!

آہ! شہر نشیں ہوں۔ روتا ہوں اور کہتا ہوں۔

ای مایوس دلو! ای مدفنِ سرور مزارو!

تمھارا خیال مجھے رُلاتا ہے۔ تمھیں سوچتا ہوں اور تم پر دل کُڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایُوس دل ہے ایسے کتنے ہو چکے ہیں اور کتنے اس وقت ہیں۔ شاید پہلے اتنے دل خون نہ ہوتے ہوں گے۔ مگر اب کیا؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے۔

دھڑک! دھڑک! اے قلبِ یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک! ٹکڑے ٹکڑے ہو جا! جا، دُور ہو جا! تیرا وجود میرے لئے بارِ گراں ہے۔ تو مزار ہے۔

(خیالستان)

سوالات

۱۔ صحرا نشین کو کون سے قدرتی مناظر متاثر کرتے ہیں۔

۲۔ شہر میں اسے کون سے تکلیف دہ سین نظر آتے ہیں۔

۳- اس مضمون میں یلدرم نے نہایت عمدہ ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ انھیں چُن کر لکھیے۔

۴- آپ بھی اسی عنوان پر اسی رنگ میں چند سطریں لکھنے کی کوشش کیجیے۔

ابوالکلام آزاد

محی الدین احمد نام ، ابوالکلام کُنیّت اور آزاد تخلّص ہے ۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے والد کی زیرِ نگرانی ہوئی ۔ فقہ، حدیث ادب عربی اور دوسرے علوم اسلامی میں اُنھیں بڑا تبحُّر حاصل ہے۔

جنگِ طرابلس کے زمانہ میں آزاد نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار الہلال جاری کیا۔ الہلال کے اجرا کے ساتھ اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۔ الہلال اپنی طرز کا بالکل نیا اخبار تھا ۔ اُس کے مضامین نے ملک میں ایک ہل چل ڈال دی۔ الہلال کے بند ہونے پر آزاد نے البلاغ جاری کیا۔

ابوالکلام کی طرزِ تحریر بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔ اُن کی تحریروں میں خطیبانہ جوش اور عالمانہ وقار ہوتا ہے۔ اُن کو انتخابِ الفاظ میں بڑا کمال حاصل ہے۔ وہ عربی کے مُغلق الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن ایسی خوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ وہ ثقیل و نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔

یادِ ایّام

لوگ بچپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں۔ مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوئر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اُسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اُس میں درختوں کا ایک جُھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں۔ اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے، اور ایک بنچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں

اب بھی یہ جھنڈ ہی کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لئے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اُس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والدِ مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو تو گھر سے نکلا کیوں؟ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اُن کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈنز میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چُن لیا تھا کیونکہ اُس طرف لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اُس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو دل کا عجب حال ہوتا ہے۔

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں

طرف اُن کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کُن شہر تھا۔ لیکن طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی۔

والدِ مرحوم میرے اِس شوقِ علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے، یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری مگر دِل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا۔

مَیں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک مسلک رکھتے تھے اور اس درجہ متصلب اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کُفر و زِندقہ تصوّر کرتے تھے۔ مَیں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سُنیں وُہ بھی سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ اس تصلب اور جمُود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور

تقلید کی چار دیواری میں گِھرا ہوا تھا اور باہر کی مخالف
ہواؤں کا وہاں تک گذر ہی نہ تھا۔ والدِ مرحوم
کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اِتّفاق ہوا وہ
بھی وہی تھے جنھیں والدِ مرحوم نے پہلے اچھی
طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ اِن کے
معیارِ عقائد و فکر پر پورے اُتر سکتے ہیں۔ اور
معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ اُن
کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی
وہاں تک رسائی ہوسکتی تھی۔ پس ظاہر ہی کہ
اس اندازہ سے بھی کسی نئی ہوا کے گذرنے کا
امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانہ کے فکری انقلابات
کا تعلق ہی میرے خاندان کی دُنیا وقت کی راہوں
سے اس درجہ دُور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں
کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی،
اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے
ہندوستان میں ہی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی
صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں

بہت دخل ہوتا ہے۔ لیکن میری سوسائٹی اوائلِ عُمر میں گھر کی چار دیواریوں کے اندر محدود رہی اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مُریدوں کا گروہ تھا۔ والدِ مرحوم کے دوستوں میں ایک بڑی تعداد علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی تھی۔ دیوان خانہ میں اکثر اُن کا مجمع رہتا۔ مگر یہ پورا مجمع بھی سرتاسر خاندانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ کسی دوسرے رنگ کی وہاں جھلک بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گذر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہوسکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا۔ مدرسہ کی تعلیمی زندگی بہرحال گھر کی چار دیواریوں کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لئے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن والدِ مرحوم

یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسہ یعنی مدرسۂ عالیہ کی تعلیم اُن کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی، اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں۔ اور کلکتہ سے باہر بھیجنا اُنھیں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے اُن سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلاشُبہ اس کے بعد قدم کُھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے۔ لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جب کہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے چودہ پندرہ برس سے آگے نہیں بڑھا۔

(شباب سے پہلے)

سوالات

۱۔ ابوالکلام آزاد نے بچپن کا زمانہ کس شغل میں گزارا اور کیوں؟

۲۔ ابوالکلام کا دماغی ورثہ کیوں تصلب اور جمود سے بوجھل تھا؟

۳۔ ابوالکلام کی تعلیم کیسے گرد و پیش میں ہوئی اور کس قسم کے اساتذہ سے انھوں نے تعلیم پائی؟

۴۔ ابوالکلام کے والد نے انھیں کسی مدرسہ میں تعلیم کیوں نہیں دلائی؟

۵۔ اپنے لڑکپن کے حالات دلچسپ انداز میں لکھیئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ تعلیم و تربیت بھی دہلی ہی میں ہوئی۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد گئے۔ حیدرآباد کی مٹی نے ایسا دامن پکڑا کہ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو رہے۔

مرزا صاحب کو اپنی تعلیم کے زمانہ میں اُستاد بہت اچھے ملے۔ ان میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ڈاکٹر نذیر احمد جنھوں نے انھیں عربی کا درس دیا اور دوسرے سی۔ اف۔ انڈریوز مشن کالج دہلی میں جہاں مرزا صاحب

تعلیم پاتے تھے انگریزی کے پروفیسر تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین کے ذریعہ اُردو زبان کو بہت کافی سرمایہ دیا۔ اُن کی طرزِ تحریر نہایت دل کش اور اندازِ بیان بہت شگفتہ ہوتا ہے۔ اُن کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان ہے اور اُسے صحیح معنوں میں کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی ظرافت نہایت شُستہ و مہذب ہوتی ہے۔ اُن کے بعض مضامین مثلاً "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، پھول والوں کی سیر، دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ، اُردو ادب میں قطعاً غیر فانی ہو چکے ہیں۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ مضامین فرحت کے نام سے سات جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

مرزا فرحت اللہ بیگ اور اُن کے
ایک دوست دانی (غلام یزدانی) جن
دنوں کالج میں تعلیم پا رہے تھے ڈاکٹر مولوی
نذیر احمد کے پاس عربی پڑھنے جایا کرتے
تھے۔ مولوی صاحب کی وفات کے چند
سال بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے
رسالۂ اُردو میں ایک بہت طویل مضمون
لکھا۔ اُس مضمون کا عنوان تھا "ڈاکٹر
نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری
زبانی" اِس مضمون میں صرف ان ہی
واقعات کا تذکرہ ہے جو مرزا فرحت اللہ

بیگ نے اپنی آنکھوں دیکھے یا مولوی
صاحب کی زبانی سُنے۔ یہاں اُس مضمون
کے بعض حصّے دئے جاتے ہیں۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلّق کہا جاتا ہے
کہ وہ وقت کا اِس قدر پابند تھا کہ لوگ اُس کو
دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ
پرست اُس کی پابندیٔ اوقات کو یورپ والوں کا ہی
حصّہ خیال کریں تو خیال کریں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میں
نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں جو
آندھی آئے، مینھ آئے روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال
کی لائبریری میں آتے تھے۔ اِدھر انھوں نے
لائبریری کے دروازے میں قدم رکھّا اور
اُدھر گھنٹا گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ لُطف یہ
ہے کہ اُن میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو
دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے؟ ایک
منشی ذکاءاللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر
پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی صاحب

اگر اِن میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے۔ اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے کہ اگر کسی شخص کو اِن تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے وہ لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ "اب آتے ہی ہوں گے۔ چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں"۔ دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ اُن کے اس نظامِ اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیّر ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے۔ اُن کی صبح کی اور عشر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا۔

صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے میوہ کا بڑا شوق تھا۔ ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو یہ حسرت رہ گئی کہ کبھی شریکِ طعام نہ ہو سکا۔ کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے! میاں کیا مزے کا آم ہے، مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔ میں نے تو تہیّہ کر لیا تھا (میاں دانی) اب انکار کریں تو کریں لیکن اُن کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے مُنھ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مُچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مُسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا۔ اور اِس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ

ہوتا تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے۔ کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپے کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہی اُس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کردی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچادیا ہی۔ بیٹا! تم بھی تجارت کرو۔ روپیہ میں دیتا ہوں۔ نوکری کی کھکیڑ اُٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا۔" جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے اُسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ، قرض داروں کے ہاں اُن کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا۔ گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا۔ اُس کے بعد کھاتا دیکھا، کردی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازا کیا۔ روپیہ جیب میں ڈالا، سلام علیکم و علیکم السلام کیا اور چل دیے۔

میری صرف و نحو بہت کمزور تھی، اور کمزور کیوں نہ ہوتی۔ شروع کئے کئی دن ہوئے تھے۔ اِعراب

میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا۔ نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا، دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اِس لئے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اِس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اِعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت چِز بِز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہاں کے اِعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں! کیا پڑھا؟" میں سمجھا کہ اِعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی۔ تمام اِعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ اُنھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی۔ ہم نے پھر اِعراب بدل دئے۔ اس سے اُن کو غُصّہ آ گیا۔ کہا "دانی تم تو پڑھو۔" انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا۔ مولوی صاحب کا

پارا ایک سو دس ڈِگری پر چڑھ گیا۔ کتاب اُٹھاکر جو پھینکی تو کمرے سے گذر کر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی۔ اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نِکل جاؤ! ابھی میرے گھر سے نِکل جاؤ! نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمھارے پڑھانے کے لائق۔" دانی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو!" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں۔" انھوں نے اُٹھنے کا اِرادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبادیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ "اب جاتے ہو یا نہیں؟" میں نے کہا "مولوی صاحب! جب تک کوئی دھکّے دے کر نہ نِکالے گا اُس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آجائیں گے۔" مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے "اچھا نہیں جاتے

تو نہ جاؤ، مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا"۔ میں نے کہا "نہ پڑھائیے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے۔" کہنے لگے "بیٹا! اس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ اب چلے جاؤ۔ کل آجانا۔" دانی نے سچ جانا۔ میں سمجھا کہ اِس وقت اٹھے اور مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر اُن کو بٹھالیا۔ مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے اور آج پڑھیں گے تو اِس وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھائیے ورنہ ہم کو یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے"۔ آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے۔ کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے! تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے شاگرد کیا ہوئے اُستاد کے اُستاد ہوگئے۔ اچھّا بھئی میں ہارا، میں ہارا۔ جاؤ خدا کے لئے کتاب اٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو۔ دیکھئے کون سا دِن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے۔" میں جاکر صحن

میں سے کتاب اُٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر اُس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمھارے شوق کو آزماتا تھا، مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے! یہ بے حیائی نہیں، میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بُری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین اُستاد کو دبا لیتے ہیں۔

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب اُلٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف و نحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا

نہ فرمایئے۔" اس کے بعد معنی بیان کئے۔ نکات بتائے اور پھر اُسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے۔ اوّل تو مجھے یوں ہی ہزاروں شعر یاد تھے۔ دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔ غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعرا اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا۔ اس میں دانی بھی شریک ہو جاتے۔ اگر کوئی شعر قصّہ طلب ہوا اور اُسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گذرا تھا تو اُس قصّے کے ساتھ اپنا قصّہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھ آدھ گھنٹا گذر جاتا مگر اس کے بعد جو وہ شعر ذہن نشین ہوتا تو اُس کا دل سے دھونا مشکل تھا۔ چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی رزمیہ قصیدا ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شُرفائے دہلی پر اُس طوفان بے تمیزی میں

گذری تھی اُس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سُناتے۔ اکثر کہا کرتے تھے میاں بچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پُتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی آئے تھے۔ ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا۔ وہ پورا ہوا اور انھوں نے دہلی کو کھک کر دیا۔

(مضامینِ فرحت، حصۂ اوّل)

سوالات

۱۔ مولوی صاحب نوجوانوں کو کس بات کا مشورہ دیتے تھے اور کیوں؟

۲۔ مولوی صاحب نے فرحت اللہ بیگ اور دانی کی کتابیں کیوں پھینک دیں اور کیوں انھیں بار بار گھر سے نکل جانے کو کہہ رہے تھے؟

۳۔ مولوی صاحب کے پڑھانے کا طریقہ کیا تھا؟

۴۔ مُندرجۂ ذیل محاوروں کو جُملوں میں استعمال کیجئے۔ بارہ پتھر باہر کرنا، چند بند ہونا، کھک کر دینا، کھکیڑ اُٹھانا، آنکھو ہی آنکھوں میں کہنا۔

۵۔ اسی رنگ میں اپنے کسی استاد کے حالات لکھنے کی کوشش کیجئے۔

رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی ضلع جون پور کے رہنے والے ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ انگریزی کی ابتدائی و ثانوی تعلیم جون پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اعلا تعلیم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں پائی۔ تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد وہیں اُردو اور فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ اب شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔

پروفیسر رشید اُردو زبان و ادب کے بہترین طنز نگار ہیں۔ طنز ادب کی ایک نہایت مشکل صنعت ہے۔ لیکن پروفیسر رشید نے اس صنعت میں کمال کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ ایک کامیاب طنز نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ

ایک اچھے مُفکّر بھی ہیں۔ اُن کا مُطالعہ نہایت وسیع اور اُن کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہے۔ انھوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ پر غور و فکر کی ہے۔ تہذیب و تمدّن سے انھیں خصوصیت کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اِسی لئے اکبر کی طرح وہ بھی ایک تمدّنی نقاد ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں اکبر سے زیادہ گہرائی اور وسعتِ نظر پائی جاتی ہے۔ وہ سوسائٹی کی دُکھتی ہوئی رگ کو بہت چابک دستی سے چھیڑتے ہیں۔

پروفیسر رشید ایک نہایت اچھے اِنشا پرداز بھی ہیں۔ اِنشا پردازی میں ان کا ایک نرالا انداز ہے۔ ان کی اِنشا میں سلاست، روانی اور عظمت و جلال پایا جاتا ہے۔

رشید احمد کے طنزیہ مضامین کے دو مجموعے مضامینِ رشید اور خنداں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اڈیٹر

اِسی شبِ برات کا واقعہ ہی کہ میں حلوا کھاتا، آتش بازی چھوڑتا پاس کی مسجد میں اذان دینے جارہا تھا کہ مجھے راستہ میں ایک بزرگ ملے۔ شکل عیش میں سُقراط کی، جُثہ خانساموں کا، بات بھٹیاروں جیسی۔ اور بحیثیتِ مجموعی ایسے کہ انھیں دیکھ کر نوجوان آمادۂ فساد ہوں، مہاجن چوکنے ہوں اور پولیس والے سیٹی بجا کر گرفتار کرلیں۔ تھوڑی دیر تک تو ہم نے انگریزی تہذیب کے مطابق گفتگو کی۔ یعنی موسم اچھا تھا یا بُرا، آج کا اخبار دیکھا یا نہیں وغیرہ۔ اس کے بعد ہندوستانی تہذیب پر اُتر آئے یعنی قوم کی تباہ حالت پر قوم کو گالی گلوج اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی، اپنے اپنے امراض ایک دوسرے کو بتلائے اور اُن کے مختلف طریقۂ

علاج پر حکیم یا ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے شیر و شکر ہوگئے جیسے امن عالم کے قیام و بقا اور تہذیب انسانی کی نگہداشت کی خاطر بڑی بڑی حکومتیں نیاز مند حکومتوں کو صبر و شکر کی تلقین کرتی ہیں اور خود بھی صبر و شکر کے ساتھ اسلحہ جاتِ جنگ کی مزید فراہمی پر غور کرنے لگتی ہیں۔ مسجد پہنچ کر ہم نے مزید گفتگو شروع کی۔ سُقراط بولے "بھئی دیکھو یورپ میں جنگ چھڑنے والی ہی اور ہندوستان میں جلسے ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے اچھے آثار ہیں۔ اِس پر طُرّہ یہ کہ تم مُؤذِّن ہو۔ پیشہ ظاہر ہی نہایت مُبارک ہی۔ میری ایک اسکیم ہی۔ تُمھارے بُشرے سے پتا چلتا ہی کہ تم اس اسکیم میں بڑی خوبی سے کھپ جاؤ گے۔ سب سے بڑی خوبی تم میں یہ ہی کہ تم کو دیکھ کر غُصّہ آتا ہی اور تُم سے مل کر ہنسی آتی ہی۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہی کہ تم موذّن ہو یعنی گھر پر فاقہ ہی کیوں نہ کرتے ہو، بلند بانگ ہونے سے باز نہ آؤ گے۔"

میں اپنے بارے میں یہ معقول باتیں ایک

نامعقول شخص سے سُن کر سوچ میں پڑ گیا۔ مجھ جیسے آدمی کا سوچ میں پڑنا ہی قیامت تھا۔ سُقراط نے اُٹھ کر مجھے سینے سے لگالیا اور بولے "دیکھو اس وقت تمھارے چہرہ سے ایک عزم کا اظہار ہو رہا ہے۔" اب تک سوچ میں پڑنے کو عزم بتاتا میں نے کبھی نہیں سُنا تھا۔ لیکن چونکہ یہ بات مجھی سے متعلق تھی اس لئے میں نے زیادہ چھان بین نہ کی اور ہمہ تن سُقراط کی اسکیم سُننے پر آمادہ ہو گیا۔

سُقراط بولے "دیکھو جب رزق اور موت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ہندوستان میں اخبار نویسی کے دروازے خود بخود کھُل جاتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اخبار نویس ہو جاؤ۔ میں تم کو بعض نہائت مجرّب اصول بتاؤں گا جن کی پیروی کر کے ایک اخبار نویس بہت نامور بن سکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ آج کل اخبار نویس کو بعض حواسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے، مثلاً آنکھ اس کے لئے بالکل زائد ہے۔ اس کا کام کان سے لیا جاسکتا ہے۔ بس جو سُنا لکھ دیا۔ گو ایسی

حالت میں اکثر ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ اڈیٹری شروع کرتے وقت کانوں کا جو سائز ہوتا ہے وہ اڈیٹری ختم کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے۔" مجھے چوکنّا ہوتے دیکھ کر سقراط نے کہا "کان کھڑے کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ کان کے دو بڑے نقص ہیں ایک تو ان کا کچّا ہونا، دوسرے ان کے کھینچے جانے کا احتمال۔ تم تو جانتے ہو جو کان کے کچّے ہوتے ہیں ان کے کان بھی کھینچے جایا کرتے ہیں۔" یہ سنتے ہی میں نے کان ڈال دئے اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔

سُقراط نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہیئے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا رہے۔ اخبار نویس کو کوئی ایسا موقع نہ دینا چاہیئے جس سے اس پر سمّن یا نوٹس تعمیل ہو بلکہ اس کے اخبار کے ذریعہ سمّن اور نوٹس دوسروں پر تعمیل ہوتے رہیں۔ اخبار نویسی شروع اس طور پر کرنی چاہیئے جیسے دین خطرہ میں ہے،

قوم فنا ہو رہی ہی، حکومت ناشدنی اور گردن زدنی ہی۔ لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کردیا اور بنک میں حساب کھول دیا۔

ایک غلط فہمی یہ ہو کہ اخبار حکومت اور رعایا کے باہمی تعلقات کو ٹھیک رکھنے میں مدد دیتا ہی۔ ممکن ہو یہ باتیں دُنیا کے کسی حصّہ میں پائی جاتی ہوں لیکن دُنیا ہی کے بعض حصّے ایسے بھی ہیں جہاں اخبار ایسے لوگ نکالتے ہیں جو بہت کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے خریدار پڑھنے لکھنے کے معاملہ میں اور بھی نیازمند ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا ایک اخبار کے اڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ وارنٹ جاری ہوا تو اڈیٹر صاحب اپنے گانوں میں دوسرے کا کھیت جوتتے ہوئے ملے۔ عدالت میں لائے گئے تو پتا چلا کہ لکھنا پڑھنا تو درکنار نشانِ انگوٹھا کی اہمیت سے بھی نا آشنا ہیں۔ اصل اڈیٹر وہ تھے جو مدّعی کے وکیل تھے۔

سُقراط نے سلسلۂ کلام قائم رکھتے ہوئے اپنا ایک واقعہ سُنانا شروع کیا۔ آپ بھی سُنیئے۔ "میرے ایک

پٹھان دوست اپنے زمانہ کے بڑے جلّاد اڈیٹروں میں شُمار ہوتے تھے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ جب کوئی بڑا جلسہ ہونے والا ہوتا تو نہایت اچھے کپڑے پہن ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر اڈیٹروں اور نامہ نگاروں کی گیلری میں جا بیٹھتے۔ جلسہ ختم ہوتے ہی سیدھے گھر واپس آتے اور مجھے راستہ سے پکڑ لیتے۔ ایک بوسیدہ مکان میں ان کا پریس تھا اور وہیں قیام بھی فرماتے۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کوئی خدمت گار بھی نہیں۔ سارے کپڑے اُتار کر کھونٹی سے لٹکا دیتے۔ صرف لنگوٹ زیبِ تن رہنے دیتے۔ سب سے پہلے حُقّہ بھرتے۔ اس کے بعد چھاپے کا ایک پتّھر دوسرے پتّھر پر رکھ کر ایک دوسرے کو گھِسنا شروع کرتے اور مجھُ سے کہتے ہاں بھئی پتّھر صاف کرلوں۔ تم ایک چار صفحے کا مضمون تو آج کے جلسہ پر لکھ ڈالو۔ میں نے کہا آپ تو جلسہ میں موجود تھے کچھُ روئداد لکھ لائے۔ بولے شرارت مت کرو۔ میں تو بغیر ٹکٹ کے

جلسہ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ دیکھو جلدی
لکھ ڈالو۔ میری طرف سے آج سینما ہو آنا۔ میں
نے کہا کچھ تو بتائیے آخر لکھوں کیا۔ بولے جی کوئی
نئی بات تھوڑی ہی ہے۔ وہی ساری باتیں جو
اخباروں میں لکھی جاتی ہیں۔ جی چاہے تو یہ پرانے
اخبار پڑے ہیں دیکھ ڈالو۔ میں نے عرض کیا،
لیکن یہ تو بتائیے کہ خطبہ میں کیا تھا کہنے لگے
"میاں تم اس پھیر میں نہ پڑو۔ خطبہ میں کیا تھا!
وہی "بڑے افسوس کی بات ہے" "ڈوبنے کا
مقام ہے" "خوابِ غفلت" "غلامی" "بھوک"
"ہم دُنیا پر حکومت کریں گے" "ہم سب کو کچا
کھا جائیں گے" "سب کچھ خطرہ میں ہے" "ہندوستان
جنّت نشان" "بھائیو، اہلِ اسلامو" میں رُکا اور
عرض کی، جناب اس میں واؤ زائد ہے۔ اڈیٹر صاحب
نے جھلّا کر کہا "تم سے کہہ چکا بکواس نہ کرو۔
کاپی یا پتھر پر سے واؤ ہی نہیں واؤ کی سات
پشت غائب کر دینا۔ اس وقت تو لکھ چلو۔

میں نے مضمون تیار کر دیا۔ اڈیٹر صاحب نے پھر سے حقّہ بھرا اور مضمون کی کتابت شروع کر دی۔ میں بولتا گیا، وہ لکھتے گئے۔ ہجّے معنی بھی بتانے پڑتے۔ آخر میں معنی پوچھنے چھوڑ دئے۔ کہنے لگے "میاں چھپنے کے بعد سب صحیح ہو جاتا ہے۔ تم نے لکھا تو زور ہی کا ہوگا۔" غرض شام تک کاپی لکھ، پتھر جما، اخبار چھاپ کر نکال دیا۔

سُقراط نے پھر کہنا شروع کیا "دیکھو اخبار چلانے میں دِقّت ہو تو رسالہ نکالو۔ اس میں فرضی لوگوں کی طرف سے ایسے سوالات دریافت کراؤ جن کے جوابات ہمیشہ کتابوں میں لکھے ملتے ہیں۔ انھیں اپنے نام سے جواب کی صورت میں شائع کر دو۔ لوگ مہمل مضامین شائع ہونے کے لئے بھیجیں گے اور اسی شرط پر خریدار بنیں گے کہ وہ مضامین شائع کر دئے جائیں۔ تم کو چاہیئے کہ ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے شائع کر دو اور کچھ ستائشی کلمات بھی لکھ دو۔ یہ لوگ تمھارے لئے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے اور تم کو ملک کا

سب سے بڑا انشا پرداز ہی نہیں بلکہ تمھارے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی مشہور کر دیں گے جو تمھاری سات پشت گذشتہ یا آئندہ کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوں گی۔

موجودہ عہد میں سب سے کامیاب اخبار وہ ہے جس میں نیم عریاں تصاویر اور ظرافت کی آڑ میں رکیک جذبات کی اشاعت کی جاتی ہو۔ جو نامہ نگاروں کی رائے کو بھلے مانسوں کی خاموشی پر ترجیح دے۔ جو معاملہ کی اصلیت پر غور نہ کرتا ہو، صرف عوام کی ذہنیت کا تابع ہو، جو اخبار کی اشاعت کو دوسروں کے ناموس پر مقدم سمجھے۔"

(خنداں)

سوالات

۱۔ رشید احمد صدیقی نے ہندوستانی اور انگریزی کا فرق کس طرح ظاہر کیا ہے؟

۲۔ رشید احمد نے سقراط کی زبان سے اخبار نویسوں پر کیا کیا طنز کئے ہیں؟

۳۔ رسالہ کو کامیاب بنانے کیلئے ان کے اڈیٹر کیا بدعنوانیاں کرتے ہیں؟

۴۔ موجودہ عہد میں کس قسم کا اخبار سب سے کامیاب سمجھا جاتا ہے؟

۵۔ مندرجۂ ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجئے:۔

کان کا کچا ہونا۔ کان کھڑے کرنا۔ کان ڈال دینا۔ بلند بانگ ہونا۔

سُدرشن

سدرشن کا اصلی نام پنڈت بدری ناتھ ہے۔
پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ اب ایک عرصے
سے اُن کا قیام بمبئی میں ہے۔

سدرشن کا شمار اُردو کے اچھے افسانہ
نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں بقول پریم چند
"نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں نہیں ملتیں" لیکن ایک
قِصّہ اوّل سے آخر تک ختم کر کے آدمی سوچنے
ضرور لگ جاتا ہے۔ اور یہی ایک قِصّہ کی سب
سے بڑی کامیابی ہے۔ سُدرشن کی ہر کہانی میں انسانی
جذبے کے کسی نہ کسی پہلو پر بھی روشنی ضرور پڑتی ہے۔

سُدرشن کا اندازِ بیان بھی دِل کش ہوتا ہے۔ وہ
کہانی نہایت مہذب اور شُستہ طریقے پر سُناتے
ہیں۔ اُن کے جُملے چھوٹے چھوٹے اور الفاظ ہلکے

پھلکے ہوتے ہیں۔

ان کی کہانیوں کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

سولہ سنگار، چندن، چشم و چراغ، بہارستان وغیرہ

شاعر کا انتخاب

چاند اور سورج کے محبوب مہاراجا نے اپنے نوعمر وزیر سے کہا "ہمیں اپنے دربار کے لئے ایک ایسے شاعر کی ضرورت ہے جو حقیقی معنوں میں شاعر ہو۔"

دوسرے دن نوعمر وزیر نے شہر میں منادی کرا دی، اور تیسرے دن ایک ہزار ایک آدمی وزیر کے محل کے نیچے کھڑے تھے اور کہتے تھے ہم سب شاعر ہیں۔ وزیر نے اکتیس دنوں میں اُن سب کی نظمیں سُنیں۔ اور دیکھا کہ وہ سب کی سب رنگین الفاظ اور حسین خیالات سے آراستہ تھیں۔ اور اُن سب میں مصری کی مٹھاس، اور مقناطیس

کی کشش تھی۔ اور پُر کیف استعارے تھے اور دل کو موہ لینے والی تشبیہیں تھیں۔

مگر اِن میں سب سے اچّھا کون ہے؟ نو عُمر وزیر اِس کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اُس نے ایک دن غور کیا، دو دن غور کیا، تین دن غور کیا۔ چوتھے دِن اُس نے سُنہری روشنائی سے گُل رنگ کاغذ پر ایک ہزار ایک شاعروں کے نام لکھے اور یہ فہرست مہاراج کی خدمت میں پیش کر دی۔

مہاراج کو حیرت ہوئی۔ "کیا یہ سب شاعر ہیں؟"

نو عُمر وزیر نے ادب سے سر جُھکایا اور آہستہ سے جواب دیا "میں نے اِن کا کلام سُنا ہے اور اُس کے بعد یہ فہرست مُرتّب کی ہے۔ ہمیں ایک شاعر کی ضرورت ہے اور یہ ایک ہزار ایک شاعر ہیں۔ میں انتخاب نہیں کر سکا۔"

مہاراج نے ایک گھنٹا غور کیا۔ دو گھنٹے غور کیا۔ تین گھنٹے غور کیا۔ چوتھے گھنٹے حُکم دیا "اِن سب کو قید کر دو۔ اِن سے بدترین قسم کی مشقّت لو۔ اور حُکم دیدو کہ آیندہ جو شخص بھی شعر کہے گا اُسے ہمارے ملک

کا سب سے طاقت ور آدمی کوڑے مار مار کر ہلاک کر دے گا۔"

نوعُمر وزیر نے سب کو قید کر دیا۔ اب ریاست میں ایک بھی شاعر نہ تھا، نہ کہیں شعر و شاعری کا ذکر ہوتا تھا۔ ریاست کے لوگ اُن بے گناہوں کی مصیبت کی کہانیاں سنتے تھے اور ان کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔

چھ ماہ کے بعد مہاراج ایک ہزار ایک شاعروں کے قید خانے میں گئے اور اُن سب کی جامہ تلاشی کا حُکم دیا۔ اور ایک ہزار ایک قیدیوں میں سے ایک سو ایک آدمی ایسے نِکلے جنھوں نے قید و بند کی انتہائی سختیوں اور حکومت کی کڑی نِگرانیوں کے باوجود رات کے وقت جاگ کر پہرے داروں سے چھُپ چھُپ کر شعر کہے تھے، اور اِس امر کی ذرا پرواہ نہ کی تھی کہ اگر مہاراج کو ہمارے اس جرم (؟) کی اِطلاع ہوگئی تو اُن کا غصّہ مُشتعِل ہو جائے گا، اور اِس مُلک کا سب سے طاقت ور آدمی ہمیں کوڑے مار مار کر ہلاک کر دے گا۔

مہاراج نے نوعُمر وزیر سے کہا "تُم نے دیکھا!

یہ نو سو آدمی شاعر نہ تھے۔ عزّ و جاہ کے بھوکے تھے۔ اِن سب کو چھ چھ ماہ کی تنخواہیں دے کر رہا کر دو۔ اور یہ ایک سو ایک آدمی کسی حد تک شاعر ہیں۔ اِن کو ہمارے عشرت محل میں جگہ دو اور ان کی خدمت کے لئے سلیقہ شعار خدمت گار مُقرّر کر دو تاکہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔"

نو عُمر وزیر نے ایسا ہی کیا۔ اب یہ شاعر بہترین لباس پہنتے تھے، پُر ذائقہ اور مقوّی کھانے کھاتے تھے، اور دن رات راگ رنگ کے جلسوں میں مصروف رہتے تھے۔

ریاست کے لوگ اُن کے عیش و طرب کی کہانیاں سُنتے تھے، اور اپنی کم نصیبی پر حسرت کی ٹھنڈی سانس بھرتے تھے۔

چھ ماہ بعد مہاراج اپنے نوعُمر وزیر کو ساتھ لے کر ایک سو ایک شاعروں کے عشرت محل میں گئے اور اُن سب کو اپنے حُضور میں طلب کر کے بولے "تم نے راحت و آرام اور سرور و انبساط کے اِس شباب آگیں زمانے میں کیا کچھ کہا؟ ما بدولت سُننا چاہتے ہیں۔"

ایک سو ایک عیش پسندوں میں سے صرف ایک فقیر منش ایسا نِکلا جس نے عشرت محل کے رقص و سرود

کے جلسوں میں شرکت نہ کی تھی، اور اِس دوران میں بھی اپنے خیالات نظم کرتا رہا تھا۔ دوسرے شراب پیتے تھے اور جھومتے تھے۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر خود ہی اپنے اشعار پڑھتا تھا اور خود ہی خوش ہوتا تھا، جیسے جنگل میں مور خود ہی ناچتا ہے خود ہی اپنا ناچ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

چاند اور سورج کے محبوب مہاراجا نے اپنے نوعمر وزیر سے کہا "یہ ایک سو آدمی بھی شاعر نہ تھے۔ عیش کے بندے تھے۔ جب یہ قید تھے اُس وقت اِن کا دِل قیدخانے کی مصیبتوں پر کُڑھتا تھا۔ ان کی آنکھیں اسیری کی محنتوں اور مشقّتوں پر روتی تھیں، اور چوں کہ اُس وقت اِن کی زندگی میں زندگی کی بہاریں نہ تھیں اِس لئے اُن دنوں انھیں اپنی زندگی عزیز نہ تھی۔ لہٰذا انھوں نے اُس وقت شعر کہے اور اُن میں اپنی قسمت کی تاریکی اور تاریکی کی قسمت کا پُر درد طریقے سے ماتم کیا۔ لیکن جب دُکھ کے وہ دِن بیت گئے اور جب وہ سیاہ گھڑیاں ختم ہوگئیں تو اِن کو شعر و شاعری کا خیال بھول گیا، یہ دُکھ کے دنوں کے شاعر ہیں۔ سُکھ کے دِنوں کے شاعر نہیں۔ اِن کو دھکّے مار مار کر محل

سے باہر نکال دو۔"

اِس کے بعد مہاراج نے اُس فقیر منش، بے پروا آدمی کی طرف اشارا کر کے کہا " یہ حقیقی شاعر ہے جو سُکھ اور دُکھ دونوں کو یکساں سمجھتا ہی۔ یہ زندگی کی چاندنی راتوں میں بھی شعر کہتا ہی۔ یہ موت کے تاریک سایوں میں بھی شعر کہتا ہی۔ شعر کہنا اِس کی فطرت ہی۔ یہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ سچّا شاعر ہی۔ یہ ایک ہزار ایک کنکروں میں ہیرا ہی۔ ہم نے اِسے آج سے اپنے دربار کا شاعر مقرّر کیا۔ ہم اِسے مُنھ مانگی تنخواہ دیں گے۔ اس کا کام صرف یہ ہی کہ ہمیں ہر روز دربار میں ایک شعر سُنا جایا کرے۔"

شاعر نے دربار میں جاکر مہاراج کو ایک دن شعر سُنایا۔ دوسرے دن شعر سُنایا۔ تیسرے دن شعر سُنایا۔ چوتھے دن اِستعفا لکھ کر بھیج دیا کہ مجھ سے یہ پابندی کی شاعری نہیں ہو سکتی۔

نوعمر وزیر نے کہا " یہ شخص کس قدر بدقسمت ہی!"

مگر مہاراج نے جواب دیا " یہ سچّا شاعر ہی۔ اگر

آج تیرا باپ یعنی میرا پہلا وزیر زندہ ہوتا تو اس شخص کے پانو پکڑ لیتا۔ یہ شخص دربار میں آئے یا نہ آئے مگر اس کی تنخواہ اس کے گھر باقاعدہ پہنچتی رہے۔"

(سولہ سنگار)

سوالات

۱۔ وزیر نے بجائے ایک کے ایک ہزار ایک شاعروں کا نام مہاراج کی خدمت میں کیوں پیش کیا؟

۲۔ مہاراج نے ان شاعروں کے متعلق کیا حکم دیا؟

۳۔ چھ مہینے کے بعد جب جیل میں ان کی جامہ تلاشی لی گئی تو کیا پتا چلا؟ مہاراج نے ان کے متعلق کیا حکم دیا؟

۴۔ دوسری چھ ماہی گذرنے کے بعد نوعمر وزیر کو کیا تجربہ ہوا؟

۵۔ سچا شاعر کون ہے؟

حصّۂ نظم

مثنویات

میر حسن

میر غلام حسن نام، حسن تخلّص، آبائی وطن دہلی تھا۔ میر حسن کی پیدائش بھی دہلی میں ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ کچھ دِنوں بعد لکھنؤ چلے گئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

تصانیف میں ایک دیوان، گیارہ مثنویاں اور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ ہے۔ مثنویوں میں مثنوی "سحرالبیان" کو خاص طور پر بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی کا درجہ اُردو زبان میں بہت بلند ہے، بلکہ زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ آج تک اس پائے کی مثنوی اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔

میر حسن کی زبان میں صفائی و روانی اور طرز ادا میں شوخی اور بانکپن غایت درجہ ہے۔

تعریفِ سخن

پلا مجھ کو ساقی شرابِ سُخن — کہ مفتوح ہو جس سے بابِ سُخن
سُخن کی مجھے فکر دن رات ہے — سُخن ہی تو ہے اور کیا بات ہے
سُخن کے طلب گار ہیں عقل مند — سُخن سے ہی نامِ نکویاں بلند
سُخن کی کریں فکر مردانِ کار — سُخن نام ان کا رکھے برقرار
سُخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام — جنھیں چاہیے ساتھ نیکی کے نام
سُخن سے سلف کی بھلائی رہے — زبانِ قلم سے بڑائی رہے
کہاں رستم و گیو و افراسیاب — سُخن سے رہی بات یہ نقل خواب
سُخن کا صِلہ یار دیتے رہے — جواہر سدا مول لیتے رہے
سُخن کا سدا گرم بازار ہے — سُخن سنج اس کا خریدار ہے
رہے جب تلک داستانِ سُخن — الٰہی رہیں قدر دانِ سُخن

سوالات

۱۔ شاعر ساقی سے شراب کی خواہش کیوں کرتا ہے؟
۲۔ شاعری کی تعریف میں شاعر نے جو کچھ کہا ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔
۳۔ رُستم، گیو اور افراسیاب کے متعلق چند جملے لکھیے۔
۴۔ آخر میں شاعر کس بات کی دُعا کرتا ہے؟
۵۔ شاعری سے متعلق جدید شعرا نے بھی نظمیں کہی ہیں۔ انھیں تلاش کر کے پڑھیے۔

خانہ باغ

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان لگے جس میں زربفت کے سائباں
چھتیں اوٗر پردے بندھے زرنگار دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال نگہ کو وہاں سے گزُرنا محال
سُنہری مغرّق چھتیں ساریاں وہ دیوار اوٗر در کی گلکاریاں
دئے ہر طرف آئینے جو لگا گیا چوگنا لُطف اُس میں سما
وہ مخمل کا فرش اُس کا سُتھرا کہ بس بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
زمیں کا کروں اُس کی میں کیا بیاں کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگِ مرمر کی چوپڑ کی نہر گئی چار سو اُس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرد اس کے سرو سہی کچھ اک دُور دُور اُس سے سیب و بہی
ہوائے بہاری سے گُل لہلہے چمن سارے شاداب اور تھے بھرے
زمرّد کے مانند سبزے کا رنگ روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار گلِ اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے بھرا باغ گُل سے چمن کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اوٗر کہیں موتیا کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جانشاں — مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار — ہر اک گل سفیدی سے مہتاب وار

(سحرالبیان)

سوالات

۱۔ شاعر نے باغ کا جو نقشا کھینچا ہی اُسے اپنے الفاظ میں لکھئے۔

۲۔ شاعر نے متعدّد پھولوں کے نام لئے ہیں۔ ان کی ایک فہرست بنائیے۔

نسیم

پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنؤ کے ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھے۔ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ عام دستور کے مطابق اُردو فارسی کی تعلیم لڑکپن ہی میں پائی۔ شاعری میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ صرف بتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔

نسیم کا نام گلزارِ نسیم کی بدولت اُردو زبان و ادب میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ گلزارِ نسیم کا شمار اُردو زبان کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں جو ایک مثنوی میں ہونی چاہئیں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ نگاری جذبات نگاری، ایجاز و اختصار، رمز و اشارہ، تشبیہہ و تمثیل، صنائع و بدائع غرض تمام شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔

داستان تاج الملوک شاہ زادہ
اور
زین الملوک بادشاہِ مشرق کی

روداد زمانِ پاستانی
یوں نقل ہی خامے کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ
سلطانِ زینِ الملوک ذی جاہ
لشکر کش و تاج دار تھا وہ
دشمن کُش و شہریار تھا وہ
خالق نے دئے تھے چار فرزند
دانا، عاقل، ذکی، خردمند
نقشا ایک اور نے جمایا
پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
وہ نور کہ صدقے مہر انور
وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو
چشمک تھی نصیب اُس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفلِ مہ جبیں سے
ثابت یہ ہوا ستارا بیں سے
پیارا یہ وہ ہی کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکئے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفلِ ابتر
مانندِ سرشکِ دیدۂ تر
پردے سے نہ دایہ نے نکالا
پتلی نسا نگاہ رکھ کے پالا
تھا افسرِ خسرواں وہ گُلفام
پالا تاج الملوک رکھ نام

جب نام خدا جواں ہوا وہ — مانندِ نظر رواں ہوا وہ
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ — نظّارا کیا پسر کا ناگاہ
مُہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی — کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا — اُس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا، یہی شور — خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور — لایا کوئی جا کے سُرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور — بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہی وہی خدا جو چاہے — مختار ہی جس طرح نباہے

(گلزارِ نسیم)

سوالات

۱- پانچواں شہزادہ بادشاہ کی نظر سے کیوں گر گیا؟

۲- بادشاہ کی آنکھیں کس طرح جاتی رہیں؟

۳- اس نظم میں شاعر نے بہت سی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ اُنھیں چُن کر لکھیے۔

قصیدہ ۱

غالب

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ عُرف، غالبؔ تخلّص، غالب کے آباد اجداد تُوران کے رہنے والے تھے۔ اِن کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ غالب آگرہ میں پیدا ہوئے، پانچ برس کی عُمر میں یتیم ہو گئے۔ چچا نے پرورش کی کچھ ہی دِنوں بعد اُن کا بھی اِنتقال ہو گیا۔ پھر ننھیال میں تربیت پائی۔

غالب بڑے ذکی و ذہین اور شگفتہ مزاج تھے، اُن کی قوتِ حافظہ بھی بہت تیز تھی طبیعت میں شوخی و ظرافت بہت تھی۔

غالب بہت قادر الکلام شاعر تھے، اُن

کے کلام میں جدتِ تخیّل اور ندرتِ بیان دونوں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے کلام میں استعارات، محاکات الفاظ وغیرہ کی بھی جدّت پائی جاتی ہے۔

غالب عام طور پر ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اُردو میں قصیدے انھوں نے بہت کم کہے ہیں لیکن بحیثیت قصیدا گو بھی اُن کا درجا بہت بلند ہے۔ قصیدے کی تمام خصوصیات اُن کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

مدحِ بہادر شاہ ظفر

صبح دم دروازۂ خاور کھُلا | مہرِ عالم تاب کا منظر کھُلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں | شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ | دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو | موتیوں کا ہر طرف گوہر کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر | اِک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر | بادۂ گُل رنگ کا ساغر کھُلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

بزمِ سُلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنھ پر کھُلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سرتا سر کھُلا

وہ، کہ جس کے ناخنِ تدبیر سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا

مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا
بادِ شہ کا رایتِ لشکر کھُلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھُلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا

ہو سکے کیا مدح، ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا

فکر اچھی پر ستایش ناتمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھُلا

جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھُلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھُلا

(دیوانِ غالب)

سوالات

۱۔ شاعر نے قصیدے کے ابتدائی اشعار میں کئی تشبیہیں استعمال کی ہیں، اُنھیں چُن کر لکھیے۔

۲۔ بہادر شاہ کی مدح میں جو اشعار کہے گئے ہیں ان میں کون سی صنعت پائی جاتی ہے؟

۳۔ شاعر نظم کے آخری حصّہ میں اپنی کس مجبوری کا اظہار کرتا ہے؟

۴۔ شاعر بادشاہ کو کیا دُعا دیتا ہے؟

مرثیہ

انیس

ببر علی نام ، انیس تخلص ۔ میر حسن دہلوی کے پوتے تھے ۔ ۱۲۱۶ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے ۔ ابتدا میں غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے پھر مرثیہ لکھنا شروع کیا ۔ اور اس صنف میں بڑا کمال حاصل کیا ۔ انھوں نے مرثیہ کو بڑی ترقّی دی ۔ ۱۰ر شوال ۱۲۹۱ھ کو انتقال کیا ۔

میر انیس کا کلام فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہے ۔ وہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے کلام میں صفائی اور طرز ادا میں جدّت ہوتی ہے ۔ تشبیہہ کی جس قدر خوبیاں انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان کی نظیر مشکل سے ملتی ہے ۔ انیس نے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی بھی کی ہے اور جذباتِ انسانی کی ترجمانی بھی ۔

صغراؔ سے رخصت

باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہِ بحر و بر آئے　　دیکھا رخِ ہمشیر کو اور اشک بہائے
ماں بیٹھی تھی صغراؔ کو جو چھاتی سے لگائے　　روتے ہوئے تشریف شہِ دیں وہیں لائے
بیٹی شہِ ذی جاہ کی تعظیم کو اُٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اُٹھی

جلد اُسکے قریب آکے یہ کہنے لگے حضرت　　بیٹھو کہ ابھی اُٹھنے کی تم میں نہیں طاقت
اک ضُعف کی تصویر ہو ایسی ہے نقاہت　　کیوں رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت
تپ میں جو کراہی تھیں تو گھبرائے تھے صغراؔ
بے ہوش تھیں تم شب کو بھی ہم آئے تھے صغراؔ

صحت دے تمھیں حق یہی بابا کی دُعا ہے　　اولاد کو راحت ہو تو جینے کا مزا ہے
اب بادیہ پیمائی ہے، ایذا ہے، بلا ہے　　کیا جانیے شبیرؑ کی تقدیر میں کیا ہے
دل جلتا ہے جب تپ میں تمھیں پاتا ہوں صغراؔ
اِس رنج سے میں اور گھُلا جاتا ہوں صغراؔ

ایسا سفرِ صُعب اور اسطرح کا بیمار　　ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائے کہیں راہ میں آزار
کیا نرگسی آنکھوں سے نقاہت ہے نمودار　　سب زرد ہے ازمانِ حرارت سے تنِ زار

چہرے پہ کسی روز بحالی نہیں پاتا
سرعت سے کبھی نبض کو خالی نہیں پاتا

دم چڑھتا ہی بستر سے اُٹھاتی ہو اگر سر — بی بی کہو محمل میں چڑھا جائے گا کیونکر
گھر میں تمھیں پانی کی بھڑک رہتی ہو دن بھر — پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر

تم جانے کے قابل نہیں، میں رہ نہیں سکتا
شب سے ہے وہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

گھر میں تمھیں چھوڑوں یہ نہیں دلکو گوارا — لے جاؤں تو بچنا نہیں ممکن ہے تمھارا
بچوں میں کوئی تم سے زیادہ نہیں پیارا — مجبور ہوں بے ہجر نہیں اب کوئی چارا

فرقت میں سدا نالہ و فریاد کروں گا
اتروں گا جو منزل پہ تمھیں یاد کروں گا

صغرؑا نے کہا آپکی اُلفت کے میں قرباں — پھر کس کو ہو گر آپکو لونڈی کا نہ ہو دھیاں
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا ساماں — مولا کی توجہ ہی ہر اک درد کا درماں

جس پہ نظرِ لُطفِ شہِ دو سرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفا ہو

قرباں گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت — تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت — پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت

حضرت کی دُعا سے مجھے صحت کا یقیں ہی
اب تو مرے مُنھ کا بھی مزا تلخ نہیں ہی

کیوں روتے ہو بابا یہ تردّد کی نہیں جا — سب سہل ہی کچھ مجھ کو نہیں ہونیکی ایذا
پہلے سے کہے دیتی ہوں ای سید والا — میں خانۂ ویراں میں نہیں رہنے کی تنہا
اب رُوح مرے جسم میں گھبراتی ہی بابا
ان باتوں سے کچھ بوئے فراق آتی ہی بابا

مرجاؤں گی بچھڑی جو مسیحِ دوسرا سے — صحت مجھے ہو جائیگی حضرتؐ کی دُعا سے
کٹ جائیگا اندوہِ سفر فضل خدا سے — بیماری میں جان آئیگی جنگل کی ہوا سے
سب ساتھ ہیں روؤں گی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا

شہ نے کہا تم حال سے میرے نہیں آگاہ — مجبور نکلتا ہوں میں اس شہر سے واللہ
آفت کا ہی بی بی یہ سفر خوف کی ہی راہ — بیمار ہو کس طرح سے لیجاؤں تمھیں آہ
آزار رسیدہ ہوں گرفتارِ بلا ہوں
گھر چھوڑ کے جلاّدوں کی سرحد میں چلا ہوں

وہ صعب پہاڑوں کا سفر اور وہ کڑے کوس — دن رات مسافر پہ کبھی دھوپ کبھی اُوس
ایک ایک قدم رنج و الم حسرت و افسوس — ہوتا نہیں جز خار کوئی آکے قدم بوس

آرام کہیں راہ میں جانی نہیں ملتا
جنگل ہیں وہ پُر ہول کہ پانی نہیں ملتا
تھوڑے ہی دنوں ہوگی کُنبے سے جُدائی
پردیس سے آکر تمھیں لیجائیں گے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے بُرائی
ممکن ہے کہ میں اور نہ کروں وعدہ وفائی
خوش ہوں گا تم اب دل پہ اگر جبر کرو گی
مرجاؤں گا جب میں تو نہ کیا صبر کرو گی

(کُلیّاتِ مراثی)

سوالات

۱۔ حضرت امام حسینؑ نے بیٹی کو ساتھ نہ لے چلنے کے لئے کیا عُذر پیش کئے؟

۲۔ بیٹی نے جواب میں کیا کہا؟

۳۔ شاعر نے حضرت امام حسینؑ کے لئے کون کون سے مختلف تعظیمی الفاظ استعمال کئے ہیں؟

۴۔ انیس کے شاعرانہ کمالات کو اچھی طرح جاننے کے لئے شبلی کی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' پڑھئے۔

منظومات

حالی

نشانِ اقبال مندی

الپ ارسلاں سے یہ طغرل نے پوچھا کہ قومیں ہیں دُنیا میں جو جلوہ فرما
نشاں اُن کی اقبال مندی کے ہیں کیا؟ کب اقبال مند اُن کو کہنا ہے زیبا؟

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ اُن کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ اُن کے جب تک

جہاں جائیں وہ سُرخ رُو ہو کے آئیں ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اُٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں نہ اُکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں

کریں مِس کو گر مَس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو

ولی عہد کی جب کہ باتیں سُنیں یہ ہنسا سُن کے فرزانہ دُور بیں یہ

کہا جانِ عم گپ ہی گو دل نشیں یہ
مگر شرط اقبال ہر گز نہیں یہ
حوادث سہے بن گذارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

بہم ہی کبھی گاہ برہم ہی محفل
کٹھن ہی کبھی گاہ آساں ہی منزل
زمانے کی گردش سے بچنا ہی مشکل
نہ محفوظ ہیں اس سے مُدبر نہ مقبل
بہت یکہ تازوں کو یاں گرتے دیکھا
سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

جہاں سُود ہی یاں وہیں ہی زیاں بھی
جہاں روشنی ہی وہیں ہی دھواں بھی
سقر بھی ہی یہ خاک داں اور جناں بھی
بہاریں بھی ہیں اس چمن میں خزاں بھی
نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلاتے بھی ہیں
چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے بھی ہیں

ضعیف اور قوی ارمنی اور عراقی
چکھاتا ہی دَورِ قدح سب کو ساقی
پہ اقبال کی ہی رمق جن میں باقی
یہ سب تلخیاں اُن کی ہیں اتفاقی
بلاؤں میں گھر کر نکل جاتے ہیں وہ
ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ

نہیں ہوتے نیرنگِ گردوں سے حیران
ہر اک درد کا ڈھونڈھ لیتے ہیں درماں
اُٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں
وہ چونک اُٹھتے ہیں دیکھ خوابِ پریشاں

بھڑکتے ہیں افسردہ ہو کر ہوا وہ
پھبکتے ہیں پژمردہ ہو کر ہوا وہ
پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر　　لگاتے ہیں غوطہ اُچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لے کے چلنے کی خاطر　　وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر
سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
اُلجھتے ہیں پیچھے سُلجھتے ہیں پہلے

(مُسدّسِ حالی)

سوالات

۱- الپ ارسلاں کی رائے میں کس قوم کو اقبال مند کہنا زیبا ہے؟
۲- طغرل کی نگاہ میں کون سی قوم اقبال مند ہے؟
۳- دوسرے بند میں کون کون سی صنعتیں استعمال میں آئی ہیں؟

حالی

لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہی کہ "گر غور کیجئے
ہی حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اوّل تو سوُجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اوّر سوجھتا بھی ہی تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہی جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظوُر اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اوّر دوست سے زیادہ نہیں کوئی بد سگال
رکھتا ہی جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر"

گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کی تہہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب اُن کے دوست کیوں نہ جتائیں گے بےخطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سُن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت اُن کی، نہ دشمن نہ دوست پر

(دیوانِ حالی)

سوالات

۱۔ حکیم کی رائے میں دشمن دوست سے مفید تر کیوں ہے؟

۲۔ حکیم دوست کو بدسگال کیوں کہتا ہے؟

۳۔ شاعر حکیم کے اس قول کو متین سمجھنے کے باوجود کیوں اختلاف کرتا ہے؟

شبلی

خلافتِ فاروقیؓ کا ایک واقعہ

عام الرّمادہ کہتے ہیں جس کو عرب میں لوگ — عہدِ خلافتِ عمریؓ کا وہ سال تھا!

اس سال قحطِ عام تھا ایسا کہ ملک میں — لوگوں کو بھوک پیاس سے جینا محال تھا

پانی کی ایک بوند نہ ٹپکی تھی ابر سے — ہر خاص و عام سخت پراگندہ حال تھا

اعراب کی بسر، حشراتِ زمیں پہ تھی — سب اُٹھ گیا جو فرقِ حرام و حلال تھا

تشویش سب سے بڑھ کے جنابِ عمرؓ کو تھی — ہر دم اسی کی فکر، اسی کا خیال تھا

تدبیر لاکھ کی تھی مگر رُک سکا نہ قحط — گو انتظامِ ملک میں ان کو کمال تھا

معمول تھا جنابِ عمرؓ کا کہ متّصل — کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا

اک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں — کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا

بچے کئی تھے ایک ضعیفہ کی گود میں — جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خُرد سال تھا

دیکھا جو اس کو یہ کہ پکاتی ہے کوئی چیز — جاتا رہا جو طبعِ حزیں میں ملال تھا

سمجھے کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی — کم ہو چلا ہے، قحط کا جو اشتعال تھا

پوچھا خود اس سے جاکے تو رونے لگی کہ آہ — کیا آپکو غذا کا بھی یاں احتمال تھا

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر — میں کیا کہوں زبان سے اِن کا جو حال تھا

مجبور ہو کے ان کے بہلنے کے واسطے — پانی چڑھا دیا ہے یہ اُس کا اُبال تھا

اُن سے یہ کہہ دیا ہے کہ اب مطمئن رہو — کھانا یہ پک رہا ہے ، اسی کا خیال تھا
بے اختیار رونے لگے حضرتِ عمرؓ — بولے کہ "یہ مرے ہی کئے کا وبال تھا
جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے مری شامتِ عمل — از بس گناہ گار مرا بال بال تھا!"
بازار جا کے لائے سب اسباب آب و ناں — جو زخمِ قحط کا سببِ اندمال تھا
چولھے کے پاس بیٹھ کے خود پھونکتے تھے آگ — چہرا تمام آگ کی گرمی سے لال تھا
بچوں نے پیٹ بھر کے جو کھایا تو کھل اُٹھے — ایک ایک اب تو فرطِ خوشی سے نہال تھا
تھی وہ زنِ ضعیف سراپا زبانِ شکر — یاں حضرتِ عمرؓ کو وہی انفعال تھا
عُہدہ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھین کر — جو کچھ گذر رہا ہے یہ اسکا وبال تھا

(کلّیاتِ شبلی)

سوالات

۱۔ عام الرمادہ میں حرام و حلال کا فرق کیوں اُٹھ گیا؟
۲۔ حضرت عمرؓ کا کیا معمول تھا؟
۳۔ ضعیفہ نے چولھے پر پانی کیوں چڑھا دیا تھا؟
۴۔ حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے کیا کیا؟

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ میں مثل خوانی پر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور سات سال تک وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد منصفی کا عُہدہ قبول کر لیا۔ سب جج سے ڈسٹرکٹ جج اور ڈسٹرکٹ جج سے سشن جج ہو گئے۔ خان بہادری کا خطاب پایا۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لی۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔

اکبر کا شمار اُردو کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری میں ایک نئے طرز کی بنا ڈالی۔ اس وقت ملک میں مغربی تہذیب رواج پا رہی تھی۔ حاکم قوم کی ہر چیز لوگوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی اور اپنی ہر چیز میں بُرائی دکھائی

دیتی تھی ۔ اکبر نے اس روش کو ملک اور قوم کے لئے مُضر سمجھا اور اس ذہنیت کی اصلاح کی کوشش کی اس مقصد کے حصول کے لئے اکبر نے طنز اور ظرافت سے کام لیا۔

اکبر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ان کی ظرافت ہی۔ اکبر نے نئی نئی تشبیہیں اور تمثیلیں استعمال کیں۔ بہت سے انگریزی الفاظ بھی استعمال کئے مگر اس خوبی سے، کہ وہ مذاقِ سلیم پر گراں نہیں گذُرتے۔

دربار دہلی

سر میں شوق کا سوُدا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچُھ دیکھا اچھّا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

نظم ہی مجھ کو بادۂ صافی — شغل یہی ہی دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی — خیر اب دیکھئے لُطفِ قوافی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے　　گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے　　بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا　　اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور ورنگل دیکھا　　عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری　　پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری　　تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

کچھ چہروں پر مردی دیکھی　　کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی　　دل نے جو حالت کردی دیکھی

ڈالی میں نارنگی دیکھی　　محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی یا رنگی دیکھی　　دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا — دِل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — اُن کا چلنا کَم کَم تھَم تھَم
زرّیں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چَم چَم چَم چَم

پُر تھا پہلوے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع — سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر کُٹتی دیکھی — سالن بھی بھیڑ میں گھُٹتی دیکھی
آتش بازی چھُٹتی دیکھی — مُفت کی دولت لُٹتی دیکھی

چوکی اک چوکھی دیکھی — خوب ہی چھکّی پکّی دیکھی
ہر سو نعمت رکھّی دیکھی — شہد اور دودھ کی مکھّی دیکھی

ایک کا حصّہ منّ و سلوا — ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا — میرا حصّہ دور کا جلوا

اوج یہ برٹش راج کا دیکھا　　پرتو تخت اور تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا　　رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر　　تخت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش اُن کے اندر　　اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی ان کا　　چرخ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی ان کا　　آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں　　ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عُمدہ ڈھب ہیں　　سب سامانِ عیش و طرب ہیں

اگزبیشن کی شان انوکھی　　ہر شے عُمدہ ہر شے چوکھی
اُقلیدس کی ناپی جوکھی　　من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہی　　شاہی فورٹ میں بال ہوا ہی
روشن ہر ایک حال ہوا ہی　　قصۂ ماضی حال ہوا ہی

ہی مشہور کوچہ و برزن	ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائرِ ہوش تھے سب کے برزن	رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک	زرّیں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا ان کا اوج سما تک	چرخ پہ زہرہ ان کی تھی گاہک

گو رقّاصہ اوج فلک تھی	اُس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی	بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کی ہی یہ بندش ذہنِ رسا نے	کوئی مانے خواہ نہ مانے
سُنتے ہیں ہم تو یہ افسانے	جس نے دیکھا ہو وہ جانے

(کُلیّاتِ اکبر)

سوالات

۱۔ دربار دہلی کا جو نقشا شاعر نے کھینچا ہی اُسے نثر میں اس طرح لکھنے کی کوشش کیجیے کہ دربار کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ جائے۔

۲۔ مُندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے:۔

من و سلویٰ۔ زہرہ۔ اندر۔ اقلیدس

چکبست

شہرِ دیرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطّۂ دل کش ہے شہرِ دیرہ دون
نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا
نئی زمین نیا رنگِ آسماں دیکھا
کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے
سپردِ ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اُس طرف ہے ہریالی
لباس پہنے ہیں گل خشت و سنگ سبزے کا
بجائے خاک کے اُڑتا ہے رنگ سبزے کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں
طلسم حُسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آ کے مُسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری اُنھیں پہلے سلام کرتے ہیں

(صبحِ وطن)

سوالات

۱۔ دیرہ دون کے سبزہ زار کو دستِ قُدرت نے کس طرح سجایا ہے؟

۲۔ دیرہ دون کے سبزہ زاروں پر خزاں کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟

۳۔ اُردو کے دوسرے شعراء نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں انھیں تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔

اقبال

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں پائی۔ پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ اعلا تعلیم لاہور گورنمنٹ کالج میں پائی۔ تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے اور تین برس تک مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے، کچھ دنوں اپنے پرانے عہدۂ پروفیسری پر رہے لیکن ملازمت کی الجھنوں کو وہ زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکے اس لئے اس عہدے سے مستعفی ہو گئے اور بیرسٹری شروع کر دی آخر میں جب صحت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو اس کو بھی ترک کر دیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

کو لاہور میں انتقال کیا۔

اقبال نے جب آنکھ کھولی تو کچھ عجیب سا ماحول پایا، لوگ تھے کہ اُن کے اِرادے سُست، دل مُردہ، قوا مضمحل، زندگی سے بے زار۔ اقبال نے ان کو زِندگی کا دَرس دیا اُن کو اُن کا صحیح مرتبہ بتایا۔ اُن کو حیات کی کشمکش کے لُطف سے آگاہ کیا۔ اقبال کے فلسفۂ حیات کی بُنیاد "حرکت" پر ہے، وہ جمود کے قائل نہیں، اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مُردہ دلوں میں ایک نئی رُوح پھونکی اور سُست اِرادوں میں جذبۂ عمل پیدا کیا۔ اُنھوں نے مُردہ دِل انسانوں کو بتایا کہ وہ اپنی تقدیر کے بنانے والے آپ ہیں۔ مختصر یہ کہ اقبال نے انسانوں میں جذبۂ بیداری پیدا کیا اور اُن کو دعوتِ عمل دی۔

اِقبال کسی خاص فِرقے یا قوم کے شاعِر نہیں وہ انسانیت کے شاعِر ہیں وہ محدُود وطنیت اور رنگ ونسل کے امتیازات سے سخت بے زار تھے۔

اقبال آزادی پر جان دیتے ہیں، اُن کا عقیدا ہی کہ غلامی اِنسان کی تمام صِفات کو نیست و نابُود کر دیتی ہی، اوٗر انسان انسانیت سے بھی محروٗم ہو جاتا ہی، وہ آزادی کے ساتھ مساوات کے بھی قائل ہیں۔

اقبال نے اُردوٗ فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔ اُن کی اُردوٗ تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) بانگ درا (۲) بالِ جبرئیل (۳) ضربِ کلیم
(۴) ارمغانِ حجاز (اس میں کچھ کلام فارسی کا بھی شامل ہی)

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہی

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اِس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایّامِ جُدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

(بالِ جبریل)

سوالات

۱۔ روحِ ارضی آدم سے یہ کیوں کہتی ہے

۲ "اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ"؟

۲۔ انسان کے تصرّف میں کیا چیزیں ہیں؟

۳۔ "آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ"؟ اس مصرع کا کیا مفہوم ہے؟

۴۔ انسان کی آہوں کے شرارے فلک تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟

۵۔ کوششِ پیہم کی جزا کیا ہے؟

چاند تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے

نظّارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا، مُدام چلنا

بیتاب ہے اِس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے

رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند، ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسمِ قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانا
کھا کھا کے طلب کا تازیانا

اِس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نِکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اِس خرام کا حُسن!
آغاز ہے عشق، اِنتہا حُسن

(بانگِ درا)

سوالات

ا۔ تاروں نے چاند سے کیا شکایت کی؟

۲۔ چاند نے تاروں کو کیا جواب دیا؟

۳۔ ہے دوڑتا اشہب زمانہ   کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس شعر کا مفہوم کیا ہے؟

۴۔ آخری شعر میں 'خرام' سے کیا مراد ہے؟

اِقبال

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمَرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانا
جو نقشِ کہُن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو
تہذیبِ نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھادو

(بالِ جبریل)

سوالات

۱۔ خدا امرا کے محلوں کے در و دیوار ہلا دینے کا حکم کیوں دیتا ہے؟
۲۔ کنجشک اور شاہین سے کن کو تشبیہہ دی گئی ہے؟
۳۔ خدا نقش کہن مٹا دینے کا حکم کیوں دیتا ہے؟ نقش کہن سے حقیقتاً کیا مراد ہے؟
۴۔ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے نکال دینے کا فرمان خدا کیوں دے رہا ہے؟
۵۔ شاعر کو آدابِ جنوں سکھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

کیفی

پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی ۱۳ ردسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پرانے رسم و رواج کے مطابق ایک مکتب میں فارسی سے ہوئی۔ اس کی تکمیل گھر پر اپنے نانا سے کی۔ انگریزی کی تعلیم سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں ہوئی، کیفی ریاست کشمیر و جموّں کے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ خدمت سے علاحدا ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سارا وقت اُردُو زبان وادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

کیفی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اُن کو اُردُو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں عالمانہ وقار اور متانت وسنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ ہندی کے الفاظ اپنی عبارت میں بڑی خوبی سے کھپاتے ہیں اسی طرح وہ خاص ہندی یا ہندو روایات وعقائد کو نہایت عُمدگی کے ساتھ اپنے اشعار میں

استعمال کرتے ہیں - ان کے یہاں مقامی خصوصیات
بھی پائی جاتی ہیں۔

بسنت

دشت بنے ہیں گلستاں کھیت ہیں کشتِ زعفراں
اُٹھتی ہے آنکھ جس طرف خلدِ نگاہ ہے سماں
آج ہوئی ہے کائنات فیضِ بہار سے جواں
گُل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لُٹاتی کیا بسنت
پتّیوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلکِ کہن نیا
طُرّۂ حور ہے بسنت
روکشِ طور ہے بسنت
لو وہ بسنت آگئی قدرتِ حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت دل کی کلی کھلا گئی

راغ کو باغ ، باغ کو رشکِ ارم بنا گئی

جو آ رہی اور پری بسنت

کیسی ہری بھری بسنت

(وارداتِ)

سوالات

۱۔ بسنت کس موسم میں آتی ہے؟

۲۔ بسنت کے آنے سے کائنات میں کیا تبدیلیاں ہو جاتی ہیں؟

۳۔ بسنت زر کس طرح لٹاتی ہے؟

۴۔ نیاز فتح پوری (مدیر نگار) نے بسنت کے موضوع سے نثر میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے اُسے پڑھیے۔

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن نام، جوش تخلّص، ملیح آباد کے رہنے والے ہیں، قصبہ لکھنؤ لہار میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے کالج میں تعلیم پا رہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، زمینداری کی ذمّے داریاں ان کے سر آ پڑیں کچھ عرصہ کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور تقریباً دس سال دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں 'ادبی نقّاد' کی خدمات انجام دیتے رہے۔

اُردو شاعری میں سب سے پہلے جوش نے کسان اور مزدور جیسے عُنوانات پر نظمیں کہیں اور شاعر انقلاب کہلائے، جوش کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ کلام میں بے حد جوش و خروش ہے۔ اُن کی تشبیہیں اچھوتی اور نادر ہوتی ہیں الفاظ کے انتخاب میں بڑے سلیقے سے کام لیتے ہیں۔

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ظُلمت کا قدم تھرّانے لگا
بادل میں چھپا تو کھول دئے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
پردا جو اٹھایا بادل کا دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل گھبرانے لگا
اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی سُلجھا تو چنیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

سوالات

۱۔ بدلی کے چاند سے جو مختلف حالتیں پیدا ہوتی ہیں انھیں اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۲۔ بدلی کے چاند کو دیکھ کر شاعر کی سمجھ میں کون سی خاص بات آئی؟

۳۔ آخری شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپور کے رہنے والے ہیں۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم، اے کیا اور وہیں شعبۂ انگریزی میں پروفیسر ہیں۔

فراق کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ وہ ایک اچھے نقاد بھی ہیں۔ شاعری تو گویا انھیں ورثہ میں ملی ہے۔ وہ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی، نظم میں وہ نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ وہ رُباعیاں بھی خوب کہتے ہیں۔ ان کی عشقیہ رُباعیاں خُصوصیت کے ساتھ بہت دل کش ہوتی ہیں۔ ان کے کلام کے مختلف مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

روحِ کائنات، شعلہ ساز،

زندگی کی للکار

آؤ اور صبر و سکوں کی صورتوں کو چھین لو
آج مجھ سے میرے دل کی راحتوں کو چھین لو
کچھ ارادے بھی تو چمکیں کیا قضا اور کیا قدر
بطنِ مستقبل سے اپنی قسمتوں کو چھین لو

زندگی کو کیوں بنا رکھا ہے اک زندانِ تنگ
اس فضا اس بحر و بر کی وسعتوں کو چھین لو
تھرتھرا اُٹھیں سرے سے آتش و باد، آب و خاک
عنصروں سے بجلیوں کی قوتوں کو چھین لو

دیکھنا کاشانۂ انساں کے بام و در کی شان
اہلِ دنیا آسماں کی رفعتوں کو چھین لو
ظلمتیں آفاق کی ہو جائیں گردِ کارواں
برق کی اور روشنی کی سرعتوں کو چھین لو

بزمِ انساں کو سجانے کے لئے تاروں کی بھی
محفلِ آراستہ کی زینتوں کو چھین لو

جورِ گلچیں برطرف اتنا گلوں سے ڈر بھی کیا
ان کے رنگوں اور ان کی نکہتوں کو چھین لو

راہ کھوٹی کر رہی ہے منزلِ دیریں کی یاد
زندگی سے زندگی کی رجعتوں کو چھین لو

زندگی اور موت سے اے اہلِ دل کچھ لے مرو
زندگی اور موت کی سب برکتوں کو چھین لو

کر دوں اک بزمِ چراغاں شامِ ہجراں کو فراق
کارواں در کارواں ان ظلمتوں کو چھین لو

(روحِ کائنات)

سوالات

۱۔ ان اشعار کو اپنے الفاظ میں اس طرح لکھنے کی کوشش کیجئے کہ وہی جوش پیدا ہو جس کا اظہار شاعر نے کیا ہے؟

۲۔ اقبال نے بانگِ درا میں خضرِ راہ کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس کا ایک حصہ زندگی سے متعلق ہے۔ ان اشعار کو پڑھئے۔

اختر شیرانی

اختر شیرانی ٹونک کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد محمود شیرانی اُردو زبان کے ایک بہت بڑے محقّق تھے۔ اختر کو بھی اُردو زبان پر پورا عبور حاصل تھا، اختر نے اُردو زبان کی نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ نثر کے ذریعہ بھی بہت کافی خدمت انجام دی۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف ادبی رسالوں کے مُدیر رہے۔

موجودہ دور کے شعراء میں اختر ایک مُمتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تخیل ہی، موسیقی ہی، بُت تراشی ہی، وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں۔

ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:-

اختر ستان، لالۂ طور، صبح بہار

نغمۂ زندگی

بربطِ کائنات پر، نغمہ سرا ہے زندگی
مست نوا ہے زندگی
وادیٔ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی
جلوہ نُما ہے زندگی

جس کی کچھ ابتدا نہیں جس کی کچھ انتہا نہیں
جس کو کبھی فنا نہیں
خواب کہِ فنا میں وہ موجِ صدا ہے زندگی
رقصِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشت زار میں
سینۂ کاشتکار میں
بن کے لہو کا اضطراب، ہمہمہ زا ہے زندگی
نغمہ سرا ہے زندگی

جام ہیں مختلف تو ہوں، ان میں شراب ایک ہے
بادۂ ناب ایک ہے
سازِ فنا میں مشترک، ایک صدا ہے زندگی
ایک نوا ہے زندگی

رہ روِ راہِ اِرتقا کے لئے اک مقام ہی
راہ زن خرام ہی
لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہی زندگی
راہ نما ہی زندگی

اس کی ہوائے تند پر تیر رہی ہی کائنات
مستِ شرابِ حیات
طائرِ دہر کے لئے ایک فِضا ہی زندگی
کیا کہوں کیا ہی زندگی

(اخترستان)

سوالات

۱۔ ان اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہی اسے سلیس نثر میں لکھئے۔
۲۔ پہلے مصرع میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہی؟
۳۔ اقبال کی نظم زندگی (بانگ درا) پڑھئے اور بتائیے کہ دونوں شاعروں کے انداز بیان میں کیا فرق ہی؟

سردار جعفری

علی سردار جعفری ریاست بلرام پور کے رہنے والے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی اعلا تعلیم کے لئے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ گئے اور وہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ام۔اے کی تیاری کر رہے تھے کہ بعض وجوہ کی بناء پر وہاں سے چلے آئے۔ اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے ام، اے کا امتحان پاس کیا۔

سردار جعفری دور حاضر کے ممتاز شعراء اور نقّادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ڈرامے بھی۔ وہ ایک شعلہ آفریں مقرر بھی ہیں۔ ان کا کلام تخیّل اور انداز بیان دونوں لحاظ سے وقیع ہے۔

ان کی شاعری کی نُمایاں خصوصیت ان کا خلوص ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محسوس کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

سردار کی نظموں کے دو مجموعے اب تک
شائع ہو چکے ہیں:۔ (۱) پرواز (۲) نئی دنیا، نثر میں
ان کی مشہور کتاب ترقی پسند ادب ہے جو ابھی حال
ہی میں شائع ہوئی ہے۔

خوشی

اجنتا کے پرانے اور پُر اسرار غاروں سے
اندھیری رات میں اکثر وہ دوشیزہ نکلتی ہے
مسیح و خضر و گوتم کو رہی ہے جستجو جس کی
زمانے لے ہزاروں سال کی ہے آرزو جس کی
جبیں پر جس کی صبح نَو کی تابانی مچلتی ہے

ازل کی تابشِ سیمیں ہے ہالہ اس کے چہرہ کا
کفِ دستِ حنائی پر ابد کی شمع جلتی ہے
مغنی کے نفس کا زیر و بم ہے سوز و ساز اس کا
نوائے شاعرِ رنگیں کے پردے میں ہے راز اس کا
وہ مے احساس کے گل رنگ پیمانے میں ڈھلتی ہے

شعاعِ نور بن کر مسکراتی ہے فضاؤں میں
وہ چشمہ بن کے کہساروں کے سینے سے اُبلتی ہے
ہمالہ کی بلندی میں ہے ہلکا سا نشاں اس کا
فرازِ آسمانِ نیلگوں ہے رازداں اس کا
وہ ماہ و انجم و خورشید کی راہوں پہ چلتی ہے

بکھر جاتی ہے عارض پر تبسم کی کرن بن کر
کسی کی آنکھ سے اشکِ محبت بن کے ڈھلتی ہے
حق و باطل کی پیکاروں میں اس کا بول بالا ہے
مجاہد کی جبیں پر اس کے پرتو سے اُجالا ہے
وہ نیزوں اور تلواروں کے سائے میں نکلتی ہے

کبھی آوارہ نکہت بن کے اُڑتی ہے ہواؤں میں
کبھی موجِ شرابِ ارغواں بن کر مچلتی ہے
جہاں رہتی ہے نقش و رنگ میں مستور رہتی ہے
بہشتِ نغمہ و آہنگ میں اک حور رہتی ہے
شبستانِ تخیل میں کنول کی طرح جلتی ہے

عناصر کا توازن ہی تو ہی سازِ بہار اس کا
جہانِ آب و گِل میں گنگناتا ہی ستار اس کا
معطّر ہو مشامِ روح دامن بھر نہیں سکتا
کوئی اس پھول کو زیبِ گریباں کر نہیں سکتا

(پرواز)

سوالات

۱۔ شاعر نے خوشی کو کن مختلف چیزوں سے تشبیہہ دی ہی؟
۲۔ اجنتا کے غاروں کو شاعر نے پُراسرار کیوں کہا ہی؟
۳۔ مُندرجۂ ذیل لفظوں میں جو واحد ہیں ان کی جمع اور جو جمع ہیں ان کے واحد لکھیے:۔

انجم، اسرار، شعاع، نقش، عناصر،

مجاز

اسرار الحق نام، مجازؔ تخلص لکھنؤ میں پیدا ہوئے
علی گڑھ سے بی، اے کا امتحان پاس کیا۔
جدید شعرا کی صف میں مجاز کو نمایاں جگہ حاصل
ہے۔ ان کی شاعری میں جدید خیالات، نہایت دل کش
پیرائے میں منظوم ہوئے ہیں۔ وہ زبان کی خوبیوں کا بہت
خیال رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم اور جدید کا نہایت
حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ رُوپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
ای غمِ دل کیا کروں ای وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی رہی شمشیر سی
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہی آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہی آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہی آخر کیا کروں
اَی غمِ دل کیا کروں، اَی وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہی یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اوٗر اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اَی غمِ دل کیا کروں، اَی وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اوٗر یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اَی غمِ دل کیا کروں، اَی وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہی جو پتّھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میٗں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اَی غمِ دل کیا کروں، اَی وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

(شب متاب)

سوالات

۱۔ اس نظم میں کس قسم کے انسان کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہی؟

۲۔ اس نظم میں شاعر نے نہایت عمدہ تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ ان کا انتخاب کیجئے۔

۳۔ ایک مختصر سی کہانی لکھیے جس میں اسی قسم کے جذبات کی عکاسی ہو جیسی اس نظم میں ہی۔

انند نرائن مُلّا

انند نرائن نام، مُلّا تخلّص، لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول، اور کیننگ کالج میں تعلیم پائی۔ اُردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وکالت اختیار کی اور نہایت کامیاب رہے۔ پہلے انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں پھر اُردو میں شعر کہنے شروع کئے۔

مُلّا کو غزل اور نظم، دونوں پر قُدرت ہے۔ اُن کی غزلوں میں تازگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں سے اُن کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

محبّانِ وطن کا نعرہ

شہیدِ جورِ گلچیں ہیں اسیرِ خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جُرم اتنا ہے ہوا خواہِ چمن ہم ہیں
ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فدائے وطن ہم ہیں

ہمارے ہی لہو کی بو صبا لے جائے گی کنعاں
ملے گا جس سے یوسف کا پتا وہ پیرہن ہم ہیں
ہمیں یہ فخر حاصل ہی پیامِ نور لائے ہیں
زمیں پہلے پہل چومی ہی جس نے وہ کرن ہم ہیں
سُلا لے گی ہمیں خاکِ وطن آغوش میں اپنی
نہ فکرِ گور رہی ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں
بنا لیں گے ترے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل
لیے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں
نہیں تیشہ تو سر ٹکرا کے جوئے شیر لائیں گے
بیابانِ جنوں میں جانشینِ کوہ کن ہم ہیں
زمانا کر رہا ہی کوششیں ہم کو مٹانے کی
ہلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کہن ہم ہیں
نہ دولت ہی، نہ ثروت ہی، نہ عہدہ ہی، نہ طاقت ہی
مگر کچھ بات ہی ہم میں کہ جانِ انجمن ہم ہیں
ترے خنجر سے اپنے دل کی طاقت آزمانا ہی
محبت ایک اپنی ہی ترا سارا زمانا ہی

فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنّت سمجھتے ہیں

کچھ ایسے آگئے ہیں تنگ ہم کُنجِ اسیری سے
کہ اب اِس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں

ہمارے شوق کی وارفتگی ہی دید کے قابل
یہ خوبختی ہی اگر ایذا اُسے راحت سمجھتے ہیں

نگاہِ قہر کی مُشتاق ہیں دل کی تمنّائیں
خطِ چینِ جبیں ہی کو خطِ قسمت سمجھتے ہیں

وطن کا ذرّہ ذرّہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہی
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملّت سمجھتے ہیں

حیاتِ عارضی صدقے حیاتِ جاودانی پر
فنا ہونا ہی اب ایک زیست کی صورت سمجھتے ہیں

ہمیں معلوم ہی اچھّی طرح تابِ جفا تیری
مگر اِس سے سوا اپنی حدِ اُلفت سمجھتے ہیں

غم و غصّہ دکھانا اک دلیلِ ناتوانی ہی
جو ہنس کر چوٹ کھاتی ہو اُسے طاقت سمجھتے ہیں

غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنّت سمجھتے ہیں

دکھانا ہو کہ لڑتے ہیں جہاں میں باوفا کیونکر
نکلتی ہو زباں سے زخم کھا کر مرحبا کیونکر

(جوئے شِیر)

سوالات

۱۔ محبّانِ وطن ظلموں سے تنگ آکر اپنے آپ کو کس طرح تسکین دیتے ہیں؟
۲۔ محبّانِ وطن۔ زنداں کو غیرتِ محفل کس طرح بنا سکتے ہیں؟
۳۔ محبّانِ وطن اپنی زندگی کا حاصل کن چیزوں کو سمجھتے ہیں؟

غزلیات

میر محمد تقی میر

میر محمد تقی نام، میر تخلص۔ ۱۷۲۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ نواب آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ زندگی کے آخری ایام میں کسی قدر سکون و اطمینان نصیب ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

میر تقی میر نہایت سنجیدہ اور وضع دار آدمی تھے۔ طبیعت میں خود داری بہت تھی، مسلسل ناکامیوں اور نامرادیوں نے زود رنج بنا دیا تھا۔

میر اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ زبان میں سادگی و صفائی اور سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ کلام میں حسرت و یاس اور سوز و گداز کا رنگ غالب ہے۔ ان کے اشعار دل میں تیر و نشتر بن کر چبھتے ہیں۔ غزل گوئی

میں اُن کا جواب نہیں۔ مثنوی میں بھی ان کا درجہ بلند ہے۔

(۱)

تھا مُستعار حُسن سے اُس کے جو نُور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ اُستخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(۳)

کو فت سے جان لب پہ آئی ہی
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہی

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہی

دیدنی ہی شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہی

دل سے نزدیک اور اتنا دور
کس سے اُس کو کچھ آشنائی ہی

بیستوں کیا ہی کوہ کن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہی

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہی میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہی

(کُلیّاتِ میر)

سوالات

۱۔ سورج میں کس کے حُسن کی ذرا سی جھلک پائی جاتی ہی؟

۲۔ چوتھے شعر میں کس واقعہ کی طرف اشارا ہی؟

۳۔ فرہاد نے کوہِ بیستوں کو کس جذبہ کے تحت کاٹ کر رکھ دیا؟

غالب

(۱)

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگئ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
تھی نو آموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہی کہ یہ کام بھی آساں نکلا
دِل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب — آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

(۲)

کوئی دن گر زندگانی اَور ہی — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہی
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ — سوزِ غم ہائے نہانی اَور ہی
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہی
دے کے خط مُنھ دیکھتا ہی نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہی
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اَور ہی

(دیوانِ غالب)

سوالات

۱۔ اس بات کا شاعر نے کیا ثبوت پیش کیا ہی کہ اہلِ محبت بے سروسامان ہوتے ہیں؟
۲۔ شاعر کی مشکل پسند طبیعت کے سامنے کون سا کام نہایت آسان ثابت ہوا؟
۳۔ شاعر نے اپنے جی میں کیا ٹھانی ہی؟
۴۔ قاصد پیغامِ زبانی پہنچانے میں کیوں پس و پیش کر رہا ہی؟

مومن خاں مومن

محمد مومن خاں نام، مومن تخلص، ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ طِب اور نجوم میں کمال حاصل کیا مگر ان کا رُجحان شاعری کی طرف زیادہ تھا۔ عُمر بھر دہلی میں قیام رہا۔ ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔

مزاج میں رنگینی اور طبیعت میں شوخی تھی۔ خوش وضع آدمی تھے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ صلہ کی تمنّا میں کسی صاحبِ ثروت کی مدح وستائش نہیں کی۔

مومن کے کلام میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں ملتی ہیں خیالات نازک اور مضامین اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی نُمایاں خصوصیت ان کا تغزّل ہے۔ مومن اپنے تخلّص کو مقطع میں کچھ اس طرح کھپاتے ہیں کہ شعر کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

(۱)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
مُنھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

مجھ سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گُل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(۲)

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
رشک پیغام ہے عنان کشِ دل — نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مانعِ ظلم ہو تغافل یار بختِ بد کو خبر نہ ہو جائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بُت آزُردہ گر نہ ہو جائے

(دیوانِ مومن)

سوالات

۱۔ دوست نے شاعر سے کیا کہا؟

۲۔ بدعت کسے کہتے ہیں؟ مقطع میں کس چیز کو بدعت کہا گیا ہے؟

۳۔ "نامہ بر" "راہبر" کس طرح بن جائے گا؟

۴۔ شاعر نے یہ بات کس طرح سمجھائی ہے کہ اسے آرام اور چین کبھی نہیں مل سکتا؟

داغ دہلوی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی، ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ مروّجہ تعلیم حاصل کر کے ذوق کے شاگرد ہوئے غدر کے بعد رام پور چلے گئے۔ ایک مدّت تک یہیں مقیم رہے۔ بالآخر حیدر آباد پہنچے۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن کے اُستاد مقرر ہوئے اٹھارہ برس کے قیام کے بعد ۷ فروری ۱۹۰۵ء کو وفات پائی۔

داغ، زبان کے بادشاہ، خیال کیے جاتے ہیں سلاست و روانی، صفائی اور شگفتگی میں داغ کا کوئی ہم پلّہ نہیں روزمرّہ اور محاورے کو بڑی خوش اسلوبی سے باندھتے ہیں۔

(۱)

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ — بس اب خانہ آباد دولت زیادہ
محبّت میں سو لُطف دیکھے ہیں لیکن — مزا دے گئی ہے شکایت زیادہ
وہ تشریف لاتے ہی بولے کہ رخصت — نہیں ہم کو ملنے کی فرصت زیادہ

الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ محبت تو کم ہے عداوت زیادہ
مری بندگی سے مرے جُرم افزوں ‌ ‌ ‌ ‌ ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ
بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں ‌ ‌ ‌ ‌ مگر پی گئے آج حضرت زیادہ

(۲)

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے ‌ ‌ ‌ ‌ دل سے سب کچھ بھُلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ دلِ بے مُدّعا دیا تو نے
مِٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب ‌ ‌ ‌ ‌ نقش ایسا جما دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو ‌ ‌ ‌ ‌ بے غرض جو دیا، دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی ‌ ‌ ‌ ‌ اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا ‌ ‌ ‌ ‌ جو دیا اے خدا دیا تو نے

(انتخابِ داغ)

سوالات

۱۔ 'خانہ آباد' 'دولت زیادہ' کس موقع پر بولتے ہیں؟
۲۔ "دلِ بے مدعا" کو شاعر ایک نعمتِ غیر مترقبہ کیوں سمجھتا ہے؟
۳۔ نقشِ باطل کسے کہتے ہیں؟

حالی

(۱)

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی، نہ جاننا اُس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُس کو تصوّر اپنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی، کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضدِّ بے کمالی۔ نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو!
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دُنیا نہ کیجیے گا

تمھارا اتھا دوستدار حالیؔ اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
سلوک اُس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا

(۲)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ‏ ‏ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح ‏ ‏ لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا ‏ ‏ گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا ‏ ‏ بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا ‏ ‏ اگر فرصت ملی مجھکو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(دیوانِ حالی)

سوالات

۱۔ حالی نے پہلے اور دوسرے شعر میں، کیا اخلاقی درس دیے ہیں؟
۲۔ تیسرے شعر میں کیا طنز پایا جاتا ہے؟
۳۔ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہتا کیوں نہیں؟
۴۔ شاعر یہ کیوں چاہتا ہے کہ اس کے آشیانہ کو آگ لگا دی جائے؟

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص۔ آپ ۱۸۷۵ء میں
ضلع اناؤ میں بمقام موہان پیدا ہوئے۔ علی گڈھ سے بی، اے
کا امتحان پاس کیا۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ سیاسی
مصروفیتوں کے باوجود آپ نے 'مشقِ سخن' جاری رکھی۔
مئی ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔

حسرت کا شمار، دورِ جدید کے ان چند شعرا میں
ہوتا ہی جنھوں نے غزل کے اصلی رنگ کو قائم رکھا۔ ان
کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور امیر کی شیرینی پائی
جاتی ہی۔ مومن کی طرح، حسرت نے نہایت نازک اور
معنی خیز ترکیبیں استعمال کی ہیں۔

(۱)

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم ۔۔۔ گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم رہاں سے ہم
معلوم سب ہی پوچھتے ہو پھر بھی مدّعا ۔۔۔ اب تم سے دل کی باتیں کہیں کیا زباں سے ہم
اَی زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے ۔۔۔ سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم

خلعت بنے گی تیرے غمِ جاں نواز کی — لیں گے یہ کام اپنے دلِ شادماں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق — پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم
حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی — اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

(۲)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت — اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

(حسرت موہانی)

سوالات

۱۔ کس بات سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کو اپنے دوست سے نہایت شدید محبت ہے؟
۲۔ شاعر جہاں سے چلا تھا وہیں کیسے پہنچ گیا؟
۳۔ کس مستحق کو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہیئے؟
۴۔ کون لوگ فکرِ دو عالم سے آزاد ہو جاتے ہیں؟

اصغر گونڈوی

اصغر حسین نام، اصغر تخلّص، ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن گورکھپور تھا۔ بہ سلسلۂ ملازمت گونڈہ میں زیادہ قیام رہا۔ اس لئے گونڈوی کہلائے۔ آپ نے ایک عرصہ تک ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

اصغر کا کلام حُسنِ تخئیل اور حُسنِ بیان کا ایک بہترین نمونہ ہی۔ وہ حکیمانہ خیالات کو نہایت دلکش پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔

(۱)

آلامِ روزگار کو آساں بنادیا — جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنادیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے اژدہام نے حیراں بنادیا
یوں مُسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا
مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہی — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنادیا
کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہی زندگی — اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنادیا

(سرودِ زندگی)

(٢)

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں ۔۔۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
وہ بہترین دورِ محبت گذر گیا ۔۔۔ اب مبتلائے کشمکشِ امتحاں نہیں
سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے ۔۔۔ جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں
تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت ۔۔۔ سب کچھ سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں
مدّت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت ۔۔۔ اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
فطرت شناس رہی ہے ازل سے اسی طرح ۔۔۔ لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

سوالات

۱۔ غمِ روزگار کو شاعر نے آسان کس طرح بنا دیا؟

۲۔ رازِ حیات کس بات میں مضمر ہے؟

۳۔ شاعر کے نزدیک بہترین درد محبت کون سا تھا؟

۴۔ شاعر عشق کی ناکامیوں کو حاصلِ زندگی کیوں سمجھتا ہے؟

انند نرائن مُلاؔ

(۱)

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تا بکے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں

پھر افق پہ ایک صبحِ نو ہے رشکِ لالہ زار
شمعِ افسردہ لئے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں انساں کا ہے پھر زندگی کے موڑ پر
کب تک آخر سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

ہر نفس ہے تیز سے کچھ تیز تر رفتارِ زیست
اب ہمیں فرصت کہاں آرام کی باتیں کریں

خونِ انساں سے لبالب آج ہے جامِ حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

لکھ رہی ہے تیغ خوں آشام تاریخِ جہاں
کس طرح ہم بزمِ مے آشام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ
شاہد و شمع و شرابِ جام کی باتیں کریں

زندگی نے توڑ ڈالے وہ پرانے بُت تمام
طاقِ نَو ڈھونڈیں نئے اصنام کی باتیں کریں

شیخ جی مُلاؔ پہ لعنت بھیجئے کافر ہے وہ
آیئے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

(۲)

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا آئی سحر یا وقتِ شام آیا

نظامِ میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

سحر کی حور کے کیا کیا نہ دیکھے خواب دُنیا نے
مگر تعبیر جب ڈھونڈھی وہی عفریتِ شام آیا

کبھی شاید اسی سے رنگ فردوسِ بشر پائے
ابھی تک تو لہو انساں کا شیطاں ہی کے کام آیا

توانا کو بہانہ چاہیئے شاید تشدّد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اِتّہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا شیخ کوثر لے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا اُملا کا جام آیا

(جوشؔ ہے شپر)

سوالات

۱۔ عہدِ گذشتہ کے شاعر کس قسم کی باتیں بیان کرتے تھے؟ زمانۂ حاضر کا شاعر ان باتوں کو کیوں پسند نہیں کرتا؟

۲۔ شاعر نظامِ مے کدہ کو بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے؟

۳۔ ایک مجبور پر شوریدگی کی تہمت کیوں لگائی گئی؟

قطعات

میر تقی میر

بے زری

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلّی کہ یوں مقدّر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے
وقتِ رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال
ایک از آنجملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیرِ نگیں
ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت، ہم زر و گوہر
چاہیے جس قدر میسّر تھا
آخرِ کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہی قلندر تھا

(کلیاتِ میر)

سوالات

۱۔ شاعر مفلس کو کس طرح تسلّی دیتا ہی؟

۲۔ شاعر نے سکندر کی شوکت و حشمت کا اظہار کس طرح کیا ہی؟

۳۔ کیا شاعر نے قلندر کا لفظ محض قافیہ کی مجبوری سے استعمال کیا ہی یا اس میں کوئی خوبی ہی؟

غالب

گذارشِ احوال

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گُسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(دیوانِ غالب)

سوالات

۱۔ شاعر اپنے آپ کو شاعری کے دائرہ سے کن دلیلوں کے ساتھ خارج کر رہا ہے؟
۲۔ شاعر اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لئے سوگند اور گواہ کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتا؟
۳۔ شاعر یہ کس طرح ثابت کرتا ہے کہ میرا روئے سخن کسی کی طرف نہیں؟
۴۔ اس قطع میں جس سہرے کی طرف اشارہ ہے اسے پڑھئے اور دیکھئے کہ غالب نے مقطع میں کون سی سخن گسترانہ بات کہی ہے؟۔

مومن

یادِ ایّام

یادِ ایّام عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون — بے دری کر رہی ہے دربانی
کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار — کیا ہوئے وہ عماد طولانی
لُٹ گئے حوض و نہر غیر از چشم — ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ رواں — خاک سارے جہان کی چھانی
سقفِ رنگین و زرنگار کہاں — جز سپہر و نجوم نورانی
شورِ زاغ و زغن ہے سمع خراش — اب کہاں بلبل و غزل خوانی
صرفِ دلقِ گدا ہوئے پردے — زینت افزائے کاخ سلطانی
آپ کاشانہ فرشِ خاک ہوا — کیسے غالیچہائے کاشانی
یا ظروف وسماط سے مجھے تھا — دعوئے قیصری و خاقانی
یا نہیں ہے مرقّع و کشکول — تا کروں تازہ رسم ساسانی

کیا کہوں اپنی گردشِ ایام — صبح نوروز ہے شبستانی
اِس چمن زار کو خزاں تھی ضرور — میں نے کیا تہہ کی بات پہچانی

(دیوانِ مومن)

سوالات

۱۔ شاعر وحشت کی حالت میں بھی سوے صحرا جانے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتا؟

۲۔ شاعر نے اپنی وحشت سرا کا جو نقشا کھینچا ہے اسے آپ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

۳۔ لٹ گئے...... اس شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

ذوق

شیخ ابراہیم نام، ذوق تخلص، خاقانی ہند خطاب، ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا کچھ دنوں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر بغیر کسی کو دکھائے مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے۔ ان کا کلام بہت جلد مقبول ہوا۔ ولی عہد سلطنت، بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوئی۔ ظفر ان کے شاگرد ہو گئے۔ ذوق کو دلی سے بے حد محبت تھی ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔

ذوق، نہایت ذہین اور طباع تھے موسیقی نجوم اور طب سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔ بڑے خدا ترس انسان تھے۔

ذوق نے اردو زبان کو بہت صاف کیا۔ ان کی غزلوں میں مضامین کی تازگی محاورات کی خوبی اور سادگی و صفائی پائی جاتی ہے۔ ان کے قصائد سے ان کی

قادر الکلامی کا پتا چلتا ہی۔ قصیدہ گوئی میں ذوق کا مرتبہ بہت بلند ہی۔

شبِ تنہائی

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اندھیرا
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں بیش اور کہاں یہ شب مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردہ میں کئے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوعِ صبح سے مُنھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہی صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چھوانے مُنھ میں آنسو
پڑھی یٰسین سرہانے بے کسی نے

مگر دن عُمر کے تھوڑے سے باقی   لگا رکھّے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے   اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر   کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذّن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

(دیوانِ ذوق)

سوالات

۱۔ شاعر رات کی تاریکی کو کس چیز سے تشبیہہ دیتا ہے؟
۲۔ آسمان نے عاشق پر کیوں اور کس طرح ظلم کئے؟
۳۔ ان مظالم کا عاشق پر کیا اثر پڑا؟

حالی

سیاسی تقریریں

ای بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہی

یہ سچ ہی کہ جادو ہی بیاں میں ترے لیکن
کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہی

ظاہر ہی نہ غصّے میں بیاں سے ترے رنجش
نے لُطف میں کچھ طرزِ بیاں اُس سے جُدا ہی

ہو دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہی

جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہی

گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفر کے
اور سُنئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہی

دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
گونگا نہیں گونگا نہیں کیا جانیے کیا ہی

کُھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اِک مُرغ ہی خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہی

تھے لب، پئے اِظہار پہ اب آ کے کُھلا یہ
انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہی

(دیوانِ حالی)

سوالات

۱۔ شاعر کو سیاسی تقریروں میں بظاہر کیا خوبیاں نظر آتی ہیں؟

۲۔ ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ شاعر کو ان مقرّروں میں کون سا سخت عیب ملتا ہی؟

۳۔ سیاسی تقریریں حقیقت میں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں؟

رُباعیّات

میر

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے — ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

انیس

کیا قدر زمیں کی آسمان کے آگے — جھکتے ہیں قوی بھی ناتوان کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں — دندان صف بستہ ہیں زبان کے آگے

ہموار ہی، گر تو تجکو کچھ باک نہیں — سرکش ہو اگر، تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا — دامن ہیں ہوا کے بجز خاک نہیں

حالی

مٹّی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

جو کرتے ہیں کچھ زبان سے کہتے ہیں وہ کم — ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حُسنِ گفتار — بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

اکبر

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھّا — افعالِ مُضر سے کچھ نہ کرنا اچھّا
اکبر نے سُنا ہی اہل غیرت سے یہی — جینا ذلّت سے ہو تو مرنا اچھّا

چکبست

بیکار تعلّی سے ہی نفرت مجھ کو
لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
اک دن خود ڈھونڈھ لیگی شہرت مجھ کو

مُلّا

فن کی دیوی کو مُسکراتے دیکھا
اک اور بلندی سے بُلاتے دیکھا
پہنچا فن کار جب کسی چوٹی پر
زینہ اوپر کو اور جاتے دیکھا

پھولوں کے مزاج میں یہ دیکھا اکثر
کانٹوں پہ تو ان کی ہی عنایت کی نظر
سینے میں کھٹک رہا ہی لیکن کیا کیا
اک دوسرے گُل کا حُسن نشتر بن کر

سوالات

میر (۱) شاعر کی رائے میں آدم کسے کہتے ہیں؟ (۲) ایک عالم ہونے کا مفہوم کیا ہے؟

انیس (۱) قوی ناتواں کے آگے کس طرح جھکتے ہیں؟ (۲) دوسرے شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

(۱) سرکش ہونا کس بات کی دلیل ہے؟ (۲) تُند خو ہونے کا کیا نقصان ہے؟

حالی (۱) اس رُباعی میں شاعر نے کسے مخاطب کیا ہے؟ (۱) شاعر مخاطب سے اپنی کس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے؟

(۱) کس قسم کے لوگ زبان کا استعمال کم کرتے ہیں؟ (۲) حسن گفتار کی ترقی کے ساتھ کیا نقصان ہوتا ہے (۳) دوسرے مصرع میں کون سی لفظی صنعت ہے؟

اکبر (۱) کچھ نہ کرنا کس حالت میں بہتر ہے؟ (۲) اہل غیرت کس قسم کی زندگی کو پسند کرتے ہیں؟

چکبست (۱) شاعر کو کس چیز سے نفرت ہے؟ (۲) شاعر شہرت کی جستجو سے کیوں بے نیازی برتتا ہے؟

مُلّا (۱) فن کی دیوی فن کار کو کہاں بُلا رہی ہے؟ (۲) چوٹی پر پہنچنے کے باوجود کیوں فنکار کی منزل ختم نہیں ہوتی؟ (۱) پھولوں کے مزاج میں کیا خاص بات ہے؟ (۲) خود پھول کے سینہ میں کیا چیز کھٹک رہی

[illegible]